عالمی تناظر

مجوزہ دستاویز نمبر 2

33 ویں کانگریس 2014ء

فہرست

تاریخ کا دھارا
بحران کا تسلسل
سرمایہ دارانہ نظام کی زندگی کا راز
مقداری آسانی
امریکہ میں بحران
یورپ کا بحران
جرمنی
برطانیہ
فرانس
اٹلی
سپین
پرتگال
یونان
ابھرتی معیشتیں
چین
طبقاتی جدوجہد کا تناظر

روس

بھارت اور پاکستان

افغانستان

لاطینی امریکہ

برازیل

وینزویلا

افریقہ

عالمی تعلقات

شام

مصر کا انقلاب

ایران

نابرابری اور سرمائے کا ارتکاز

طبقات کے مابین خلیج

مجتمع شدہ معیشت

عوامی تنظیمیں

یونینز

نوجوانوں کا کردار

کیا انقلاب کے لئے حالات تیار ہیں؟

تاریخ کا دھارا

مارکسزم، تاریخ کو گہرائی اور وسعت میں دیکھتا ہے۔ تاریخ میں بلا شبہ ایسے لمحات ہوتے ہیں جو کہ انتہائی فیصلہ کن ہوا کرتے ہیں۔ جیسا کہ 1789ء، 1917ء اور 1929ء کے سال تھے۔ یہ ایسے لمحات ہوتے ہیں کہ جب تاریخ کا دھارا تیز تر ہو جاتا ہے۔ وہ عمل کہ جب ہر چیز ایک جیسی اور ٹھہری ہوئی لگ رہی ہوتی ہے، اپنی ضد اور الٹ میں بدلنا شروع ہو جاتی ہے۔ تاریخ کے انہی فیصلہ کن لمحات میں ہم اب 2008ء کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔ 2008ء کے بحران کے بعد سے شروع ہونے والا عرصہ اور عہد اپنا اظہار شدید ہوتی ہوئی طبقاتی کشمکش، ریاستوں کے مابین تعلقات، جنگوں اور عالمی تنازعات کی صورت میں کر رہا ہے۔

جدلیات، واقعات و معاملات کو ان کے باہمی تضادات کے ارتقا میں دیکھتی ہے۔ جدلیاتی طریق کار ہمیں وہ بصیرت فراہم کرتا ہے جس کی مدد سے ہم فوری اور بظاہر نظر آنے والی کیفیات (حقائق) سے بلند ہو کر دیکھ سکیں اور جس کی معاونت سے ہم سطح کے بہت نیچے گہرائی میں پنپ رہے عوامل کو جانچ اور پرکھ سکیں۔ تاریخی طور پر سرمایہ دارانہ نظام خود ہی اپنے اندرونی تنازعات کو جنم دیتا اور یوں اپنے اندرونی نظم و نسق کو بگاڑتا اور اکھاڑتا ہے۔ بحرانوں کے دوران آنے والے وقفوں میں یہ صورتحال نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ معیشت کے میدان میں یہ کیفیت بحران اور عروج کی شکل میں سامنے آتی ہے اور جو کہ گزشتہ دو سو سالوں سے سرمایہ دارانہ نظام کا بنیادی خاصا چلی آ رہی ہے۔ خوشحالی اور بھرپور روزگار کے ادوار اپنے دامن میں ہی بحرانوں کو لئے ہوتے ہیں، جن کے دوران سرمایہ کاری رک جاتی ہے اور کارخانے بند ہو جاتے ہیں۔ بیروزگاری بڑھنا شروع ہو جاتی ہے اور پیداواری قوتیں سکڑنے لگتی ہیں۔

مارکس نے وضاحت کی تھی کہ سبھی حقیقی سرمایہ دارانہ بحرانوں کا بنیادی سبب زائد پیداوار ہوتی ہے۔ جسے آج کل کے جدید معاشی ماہرین کی زبان میں ''زائد ہوئی صلاحیت'' قرار دیا جاتا

ہے۔ یہ ایک حقیقت کہ سرمایہ دارانہ سماج اس لئے بحران میں چلا جاتا ہے کیونکہ یہ بہت زیادہ پیداوار کر رہا ہوتا ہے، اس کا پہلے کے کسی نظام کے اندر تصور تک موجود نہیں تھا۔ یہی سرمایہ دارانہ نظام کا بنیادی تضاد ہے۔ اور اس تضاد کا ازالہ کسی طور بھی ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت اور قومی ریاست کی موجودگی میں نہیں ہوسکتا۔ آج سے قبل تیس سالوں تک جو کچھ بھی ہمیں نظر آ رہا تھا، اب وہ تاریخ کے ہاتھوں غلط ثابت ہو چکا ہے۔

سٹالنزم کا انہدام ایک انتہائی اہم موڑ تھا۔ نفسیاتی نقطہ نظر سے اس واقعے نے بورژوازی اور اس کے نظریاتی محافظین کو جیسے ایک نئی زندگی بخش دی۔ اس واقعے نے سوشل ڈیموکریسی کو سرمایہ داری کے کیمپ میں دھکیل دیا اور جہاں سے یہ ''آزاد منڈی کی معیشت'' کے واہمے کے بارے میں خوش گمان ہوتی چلی گئی۔ اس واقعے نے سٹالنسٹ پارٹیوں پر مہر ثبت کر دی جنہوں نے سوشلزم کے ساتھ اپنی ہر قسم کی وابستگی اور رغبت سے کنارہ کشی کرتے ہوئے سوشل ڈیموکریسی کا بدرنگ لبادہ پہن لیا۔ اسی عمل نے مزدور تحریک کے اندر بائیں بازو کی اصلاح پسندی کے انہدام کو ایک عملی رجحان کے طور پر مسلط کر دیا۔

قرضہ بازی کے انتہائی غیر معمولی پھیلاؤ اور نام نہاد عالمگیریت کے ذریعے عالمی سطح پر محنت کی تقسیم میں پیدا ہونے والی شدت کی وجہ سے، اپنے پچھلے عروج کے دوران، سرمایہ دارانہ نظام اپنی فطری حدود و قیود سے یکسر باہر نکلتا چلا گیا۔ عالمگیر پیمانے پر اوپر کی طرف جاتی تجارت نے سرمایہ دارانہ نظام کو مجبور کر دیا کہ وہ بلندی کی طرف کھنچتا ہی چلا جائے۔ صارفین کو دیا جانے والے قرضوں کے فروغ نے عارضی طور پر طلب کو بڑھاوا دیے رکھا۔ برطانیہ کو دیکھیں کہ جہاں نجی قرضے کا حجم گزشتہ پچاس سالوں میں میں دوگنا ہو کر وہاں کی مجموعی قومی آمدنی کے مقابلے میں 200 فیصد ہو چکا ہے۔ امریکہ سمیت کئی دوسرے ملک بھی اسی زوال پذیری کی زد میں آ گئے۔

سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا، منڈیاں رش پکڑے ہوئے تھیں، ہر کوئی خوش و خرم تھا۔ سرمایہ دار دنیا ایک سرخوشی کے عالم میں گھوم اور جھوم رہی تھی کیونکہ سب بہترین جا رہا تھا۔

لیکن پھر اچانک ہی 2008ء میں سب منہدم ہو گیا۔ لہمن برادرز بینک کے منہدم ہوتے ہی سرمایہ داری 1929ء کے بحران کی کیفیت کے قریب تر ہوتی چلی گئی۔ بلکہ یہ کیفیت اس سے بھی بڑھ کر شدید تھی۔ اس سب کو بے تحاشا عوامی سرمائے کے انجکشن لگا کر بچایا گیا۔ بینکوں کی طرف سے قرضے بازی سے پیدا ہونے والے ہر خسارے کو ٹیکس دہندگان کے سرمائے سے پورا کیا گیا۔ ریاست کے بارے میں ماہرین معیشت اب تک یہ قرار دیتے چلے آ رہے تھے کہ اسے کسی طرح منڈی کے معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہئے، اب وہی ریاست ہے کہ جس سے کہا اور کروایا جا رہا ہے کہ منڈی کی سبھی کارستانیوں کا خمیازہ بھی بھگتے اور اس کا کفارہ بھی ادا کرے۔

بحران کا تسلسل

2008ء کے بعد سے وہ سبھی عوامل و عناصر کہ جو نظام کو اوپر کی جانب لئے چلے جا رہے تھے، وہی اس بلندی کو پستی کی طرف بھی کھینچ لائے۔ قرضے بازی میں اندھا دھند شدت نے اُدھار کا ایک بہت بڑا پہاڑ کھڑا کر دیا۔ جو کہ صارفیت کیلئے ایک بہت بھاری بوجھ ثابت ہوتا چلا گیا اور یہ بھاری بھرکم بوجھ معیشت کو پستی سے پاتال کی جانب دھکیلے چلا جا رہا ہے۔

ذرائع ابلاغ اور سیاستدان تو بحالی کا تذکرہ کر رہے ہیں لیکن معیشت کے فکرمند اور سنجیدہ حکمت ساز قنوطیت کی تاریک ترین غار میں خود کو بے بس و لاچار پا رہے ہیں۔ سنجیدہ معاشی ماہرین بحالی کی بات نہیں کر رہے بلکہ اس کے برعکس ایک اور زیادہ شدید بحران کے خطرے سے خبردار کر رہے ہیں۔ بحالی کی بات محض ایک آسان فہم ادبی محاورہ ہے جسے سرمایہ کاروں کے اعصاب کو کھنچاؤ سے محفوظ رکھنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ ان کا اعتماد کسی طرح سے بحال کیا جا سکے۔

اگر آسان زبان میں بات کہی جائے تو وہ کچھ یوں ہے کہ امریکہ میں ہونے والی بحالی کسی بھی بحران کے بعد ہونے والی بحالی کے حوالے سے کم ترین شرح کی حامل ہے۔ عام طور پر یہی

ہوتا آ رہا تھا کہ بحران کے بعد سے ابھرنے والی بحالی کے دوران، پیداواری شعبے میں سرمایہ کاری کے باعث، معیشت واپس تیزی سے اٹھنا شروع کر دیتی تھی، پیداواری سرمایہ کاری ہی وہ عمل ہے جو کہ سرمایہ دارانہ نظام کی رگوں میں خون کا کام سرانجام دیتی ہے۔لیکن اب کی بار ایسا کچھ بھی نہیں ہوا، نہ ہو پا رہا ہے۔آئی ایم ایف کے مطابق عالمی تجارت اب 2.9 فیصد کی شرح سے بحالی کی پٹڑی پر آنا شروع ہو گئی ہے۔سابقہ سبھی بحالیوں کی شرح کے مقابلے میں یہ شرح تقریباً اس کا نصف ہے، جو بحران سے قبل موجود تھی۔

سرمایہ دارانہ نظام کی نامعقول فطرت، جو کہ اپنے ناقابل حل اندرونی تضادات سے پہلے ہی کمزور طبع کی حامل ہوتی تھی، ''گلوبلائزیشن'' نے اس بیچاری کو اور بھی جلد باز، دردناک اور تباہ کن کیفیت اور مزاج سے دوچار کر ڈالا۔قومی خودمختاری وحمیت سوائے ایک بے معنی اور کھوکھلے لفظ کے کچھ بھی نہیں رہا کیونکہ ہر ایک حکومت کو وہی کچھ کرنا ہوتا اور کرنا پڑ رہا ہے جو عالمی منڈی کے تقاضوں اور احکامات کو وارے ہوتا ہے۔باقاعدگی اور توازن کے سبھی دعوؤں کے باوجود سٹے بازی اور بے یقینی دیو کے سائے کی طرح مسلط ہے۔سرمائے کا ایک بہت بڑا حصہ ساری دنیا میں ادھر اُدھر چکر لگاتا پھر رہا ہے جس کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ ایک بڑا اور ناخوشگوار معاشی انہدام اس سے جنم لے سکتا ہے۔عالمی سطح پر سرمائے کی گردش کا حجم 2008ء میں 59 ٹریلین ڈالر تھا جبکہ 2012ء میں یہ 67 ٹریلین ڈالرز تک پہنچ گیا۔یہ ظاہر کرتا ہے کہ کیسے ہمارے عہد کی بورژوازی اپنے سرمائے کو کہیں کھپانے کیلئے کتنی حواس باختہ ہو چکی ہے۔آپس میں جڑی ہوئی لیکن باہمی تال میل سے محروم سرمائے کی یہ بھائی چارگی کس قدر بیچارگی کی زد میں ہے کہ کسی کو اس بارے میں کچھ سمجھ ہی نہیں آ پا رہا۔اور یہ بیچارگی مزید پیچیدگیوں اور اندیشوں کو جنم دیتی چلی جا رہی ہے۔

منڈیوں کے اچانک اتار اور اچانک چڑھاؤ سے عیاں ہوتا ہے کہ ہمارے عہد کی بورژوازی کس مصیبت کا شکار ہو چکی ہے۔ایک معمولی سی آہٹ بھی ان کے سکون کو تہہ و بالا کر رہی ہے۔پرتگال کا سیاسی تناؤ ہو یا مصر میں سماجی بے چینی، چینی معیشت کے حوالے سے پنپتی بے یقینی ہو یا مشرق وسطیٰ کے اندر کسی عسکری ایکشن کے امکانات کا اندیشہ اور اس کے ردعمل میں تیل کی

قیمتوں میں اضافے کا خطرہ؛ یہ سب وہ خوف ہیں جن کا تصور ہی سرمایہ دارانہ نظام کو ایک اور گہرے بحران کی طرف دھکیل سکتا ہے۔ حکومتی قرضوں پر چڑھنے والی شرح سود کی کیفیت ہسپتال میں داخل کسی مریض کے اس چارٹ کی ہو چکی ہے جس پر اس کے بخار کا اتار چڑھاؤ درج ہوتا ہے۔ ایک مخصوص حد کے بعد اس مریض کے درجہ حرارت میں معمولی سا اضافہ بھی اس کے لئے جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی زندگی کا راز

اس وقت جو سب سے سنجیدہ مسئلہ درپیش ہے، وہ پیداواری شعبے میں سرمایہ کاری کی قلت کا ہے۔ امریکہ کے اندر نجی سرمایہ کاری ماضی میں قومی دھارے میں اپنا حصہ ڈالتی چلی آ رہی تھی مگر اب یہ اتنا بھی نہیں کر رہی، حالانکہ پبلک سرمایہ کاری 2010ء تک عروج پر لے جائی گئی تا کہ نجی سرمایہ کاری کو حوصلہ دیا جا سکے، اس کے بعد سے یہ بھی گراوٹ کا شکار چلی آ رہی ہے۔ سرمایہ دار کسی بھی ایسے پیداواری شعبے یا سرگرمی میں سرمایہ کاری نہیں کر رہے کہ جہاں انہیں امریکہ کے محنت کشوں کو روزگار دینا پڑ جائے۔ اور جس سے معیشت کی مستحکم بحالی کے آثار سامنے آ سکیں۔ چونکہ ان سرمایہ داروں کے پاس ''منڈی'' موجود نہیں جہاں یہ اپنی اشیا کو فروخت کر سکیں دوسرے الفاظ میں ایسی جگہ جہاں ان ''اشیا کی موثر طلب'' موجود ہو۔

چنانچہ معاشی منظر نامہ تاریک بھی ہے اور بے یقینی کا شکار بھی۔ کوئی بھی فرد نہ تو کچھ خریدنا چاہتا ہے نہ ہی سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہے۔ اس کا نمایاں اظہار ہمیں تجارتی سرمایہ کاری میں کسی بھی ترقی کی غیر موجودگی سے ہوتا ہے۔ 2013ء کے دوران روزگار کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے لیکن ''فیکٹری'' کے شعبے میں روزگار میں مسلسل گراوٹ ہے۔ یہ دعویٰ کہ امریکہ میں ہونے والی بحالی پیداواریت میں اضافے کا باعث بنے گی، صریحاً جھوٹ ثابت ہو چکا ہے۔ ایک صحتمند اور پائیدار بحالی کا یقینی انحصار پیداواری سرمایہ کاری سے وابستہ ہوتا ہے۔ مکڈونلڈز کے برگروں کی فروخت بڑھنے سے معیشت نہ پائیدار ہوتی نہ ہی صحتمند۔

حقیقت یہ ہے کہ آج سرمایہ کاری کی لاگت 2008ء سے بھی بہت ہی کم ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ میں تجارت پر سرمایہ کاری بھی 2008ء کی مناسبت سے کچھ ہی زیادہ ہے۔ عوامی تجارت کرنے والی امریکہ کی بڑی 40 کمپنیوں کے ایک حالیہ سروے میں کہا گیا ہے کہ ان میں سے نصف ہی بمشکل 2013ء میں سرمایہ کاری کی اپنی شرح برقرار رکھ پائی ہیں۔ جونکتہ یہاں درپیش ہے وہ یہ ہے کہ جب وہ اپنی موجودہ پیداواری صلاحیت کو ہی نہیں کھپا پا رہیں تو وہ کیونکر نئی اور مہنگی مشینری اور کمپیوٹروں پر یا نئے کارخانوں کی تعمیر پر سرمایہ کاری کریں؟

برطانیہ میں سرگرم سرمائے کا محض 15 فیصد ہی سرمایہ کاری میں بروئے کار لایا جاتا ہے۔ باقی سب کا سب موجود کارپوریٹ اثاثوں کی معاونت، جائیدادوں یا پھر غیر محفوظ شخصی قرضوں کیلئے کام میں لایا جاتا ہے۔ نئے پلانٹ یا مشینری لگانے کی بجائے کمپنیاں نامناسب شرح منافع پر قرضے لے کر اپنے ہی حصص خریدنے پر خرچ کئے جا رہی ہیں۔ صرف امریکہ کے اندر 2013ء کے پہلے نو مہینوں میں اس کار خیر پر 308 بلین ڈالرز خرچ کئے گئے ہیں۔

چنانچہ مسئلہ یہ نہیں کہ سرمایہ موجود نہیں ہے۔ امریکہ میں تجارت کرنے والوں کے پاس خزانے ہی خزانے موجود ہیں لیکن اس کے باوجود وہ سرمایہ کاری کیلئے راضی نہیں ہیں۔ گزشتہ چار سالوں میں بے تحاشا سرمایہ، معیشت میں، خصوصاً بینکوں کو رواں کرنے کیلئے انڈیلا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ پبلک قرضے میں انتہائی خطرناک اضافے کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ اور یہ سب، نام کی حد تک کی بھی کسی معاشی یا پیداواری بحالی کے بغیر ہوا ہے۔ اس کے باوجود بھی (مارچ 2013ء کی فوربس رپورٹ کے مطابق) ''موڈیز'' کا تخمینہ ہے کہ 2013ء کے اوائل میں ہی امریکہ کی غیر مالیاتی کمپنیاں 1.45 ٹریلین ڈالرز مالیتی رقم ڈکار چکی ہیں۔ صرف 2012ء میں یہ اضافہ 130 بلین ڈالرز تھا اور یہ کوئی نیا مظہر نہیں ہے۔ 1920ء کی دہائی کے آخر میں بھی معیشت میں غیر خرچ شدہ نقد سرمائے کی بہت بھاری مقدار موجود تھی۔ اور تب ہی عظیم زوال حتمی طور پر رونما ہوا تھا۔

بورژوا معاشی ماہرین ''زائد پیداوار'' کی بجائے کچھ اور اصطلاحیں استعمال کرنے کی کوشش

کرتے ہیں تا کہ حقیقی صورتحال کی پردہ پوشی کی جائے (بدقسمتی سے کچھ اپنے تئیں مارکس وادی بھی ایسی ہی کاوشیں کرنے میں سکون محسوس کرتے ہیں)۔لیکن مارکسی نقطہ نظر سے بحران کی اصلی و اساسی وجہ صاف عیاں ہے۔ پیداواری عمل کے دوران قدرِزائد نچوڑ لی جاتی ہے،لیکن اس سے رقم کمانے کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔محنت کرنے والوں کی اجرتوں سے قدرِزائد نچوڑنے کی صلاحیت کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ منڈی میں کس قدر اور کس طرح اپنی اشیا بیچ پاتا ہے۔لیکن اس کا پھر انحصار سماج میں ایک ''موثر طلب'' کی کیفیت پر ہوتا ہے یعنی کوئی کسی شے کو خریدنے کی کتنی اہلیت رکھتا ہے!

سرمایہ داروں کی شرح منافع کے حصول کی ہوس حدود و قیود سے ماورا ہوتی ہے۔لیکن شومئی قسمت کہ اس کی اپنی اشیا کو فروخت کرنے کیلئے منڈی تلاش کرنے کی صلاحیت کی مخصوص حدود ہوا کرتی ہیں۔عالمی معیشت بری طرح سے امریکہ پر دارومدار کرتی چلی آرہی ہے۔سچ تو یہ ہے کہ ساری دنیا ہی امریکہ کی صارفیت پر تکیہ کر چکی ہے۔لیکن عالمی معاشی ترقی کیلئے امریکی صارفیت کو انجن سمجھے رکھنا، ایک مافوق فہم کی کیفیت ہے ۔ امریکی بحالی کی ابتدا سے ہی وہاں کی عمومی آمدنیاں 5.4 فیصد تک گر چکی ہیں۔ بیروزگاری 7 فیصد کی شرح پر ہے۔صارفیت امریکی مجموعی قومی آمدنی کے 70 فیصد پر مبنی ہے جبکہ اس کا 16 فیصد ہی عالمی طلب کا حامل ہے۔ ہر ملک کے برآمد کنندگان یہ امید باندھے ہوئے ہیں کہ بہت جلد امریکی صارفیت ان کی ڈوبتی کشتی کو بچانے کیلئے آئے گی۔

لیکن یہ تگ و دو نئے تضادات کو جنم دیتی ہے۔گزشتہ سال ہی امریکہ کی درآمدات کے دباؤ کے باعث امریکہ کا تجارتی خسارہ 12 فیصد بڑھتے ہوئے 45 بلین ڈالرز کو پہنچ گیا جو کہ گزشتہ پانچ سالوں میں سب سے بڑا اضافہ ہے ۔چین سے ہونے والی درآمدات اس کا دو تہائی حصہ رہیں۔ یہ صورتحال جاری رہی تو امریکہ اور چین کے مابین تجارتی خسارہ 300 بلین ڈالرز سے تجاوز کر جائے گا۔دوسری طرف امریکی برآمدات گراوٹ کی زد میں ہیں۔صدر اوبامہ کا پانچ

سالوں میں امریکی برآمدات کو دوگنا کرنے کا خواب ریت کی دیوار ثابت ہو چکا ہے۔ یوں امریکی معیشت خود تو ڈوبے گی لیکن اپنے ساتھ باقی دنیا کی معیشت کو بھی گہرے پانیوں میں ڈبودے گی۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ساری عالمی معیشت نے اپنی بحالی کی امیدیں امریکی بحالی سے وابستہ کر رکھی ہیں۔ اس سے ہمیں وہ پرانی روسی لوک کہانی یاد آتی ہے کہ جس میں مرغی کی ٹانگوں پر محل قائم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

مقداری آسانی

امریکہ اور دیگر ممالک میں جو بھی مبینہ بحالی اس وقت بتائی اور بنائی جارہی ہے وہ بے تحاشا مقدار میں معیشت میں ڈالی جانے والی مصنوعی رقم کے دم خم سے ہے۔ ایک ایسے مریض کی طرح جس کو مسلسل خون دے کر زندہ رکھنا پڑ رہا ہو، سرمایہ دارانہ نظام کو بھی مسلسل عوام کے سرمائے کے ذریعے بچانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مرکزی بینکوں کو مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ مقداری آسانی کا وطیرہ اپنائیں۔ سادہ لفظوں میں اگر کہا جائے تو وہ یہ کہ کرنسی نوٹ چھاپے جائیں اور چھاپے جاتے رہیں۔ لیکن مقداری آسانی اور صفر شرح سود کے طریقے بھی کارگر ثابت نہیں ہو پا رہے۔ بلکہ ان کی وجہ سے افراط زر نے آگ پکڑنا شروع کر دی ہے۔

امریکی معیشت میں بہتری کسی طور معمولی نوعیت کی مانیٹری پالیسیوں سے نہیں ہونی تھی جو کہ فیڈرل ریزرو بینک 2009ء سے اپنائے چلا آرہا تھا۔ فیڈرل ریزرو نے مالیاتی اثاثے؛ امریکی ٹریژری بانڈز اور کچھ کارپوریٹ قرضے خریدنے شروع کر دیئے۔ مانیٹری بنیادوں کو کچھ آسان کرتے ہوئے انہوں نے شرح سود کو کم کئے رکھا تاکہ قرضوں میں ڈوب چکے کاروباروں اور گھروں کو سہارا دیا جاسکے۔ بحالی کے پیچھے یہی عنصر زیادہ کارفرما ہے اور یہ مالیاتی منڈیوں کو ویسے ہی سہارا دے رہا ہے جیسے کوئی بیساکھی، ٹانگوں سے محروم فرد کو دیتی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام پاگل منافع خوروں کے مالیاتی نظم ونسق کی مانند کام کیا کرتا ہے۔جلد سے جلد منافعوں کی ہوس میں پچھلے بیس سالوں کے دوران بورژوازی نے سٹے بازی کرتے ہوئے جائیدادوں کی قیمتوں میں دیوہیکل افراط زر کو فروغ دیئے رکھا اور یہ پاگل پن 2008ء کے انہدام تک جاری رکھا گیا۔اور یہ سب کچھ فیڈرل ریزرو کی اس پالیسی کے زیر اثر کیا جاتا رہا کہ جس کے تحت شرح سود نیچے رکھی جائے۔اب ایسی ہی بیہودہ پالیسی بلبلے کو تفریط میں لانے کیلئے بروئے کار لائی جارہی ہے۔یوں لگتا ہے کہ یہ لوگ فراموش کر چکے ہیں کہ بالکل اسی پالیسی کی بدولت ہی انہیں اس انہدام کا سامنا کرنا پڑا۔ایسا لگ رہا ہے کہ بورژوازی اپنے ہوش وحواس سے باہر ہو چکی ہے۔لیکن یہ وہی کیفیت ہے جس کے بارے ایک بار لینن نے کہا تھا کہ ''ایک کھائی کے کنارے پر موجود شخص سدھ بدھ گنوا دیتا ہے۔''

فیڈرل ریزرو بینک کے مقداری آسانی (Quantitative Easing) پروگرام کا ماہانہ تخمینہ 85 بلین ڈالرز ہے۔برطانیہ، یوروزون اور یہاں تک کہ جاپان بھی فیڈرل ریزرو کے سربراہ برنانکے کی اسی طویل المیعاد آسان سرمائے کے وعدے کی پالیسی پر غلامانہ طرز سے عملدرآمد کئے جارہے ہیں۔ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ سب ایک ایسے وقت میں کیا جارہا ہے کہ جب برنانکے اس سے واپسی کی کوشش کر رہا ہے۔برنانکے اس وقت ایک عجیب وغریب کشمکش اور الجھن کا شکار ہو چکا ہے۔نہ اب پیش قدمی آسان ہے نہ ہی پسپائی۔اس نے اشارے دینے شروع کر دیے ہیں کہ صفر شرح سود کو ختم کیا جاسکتا ہے۔یہ اشارہ اس احتیاط کو مدنظر رکھتے ہوئے دیا گیا ہے کہ اس سے منڈی میں کوئی بھگدڑ نہ مچ جائے۔

وہ سب کے سب جو اس سرگرمی میں شریک ہیں اور اسے جاری رکھے چلے جارہے ہیں وہ سب اچھی طرح باخبر ہیں کہ وہ ایک انتہائی خطرناک تجربہ کر رہے ہیں۔اس خطرے سے انہیں کچھ وقت پہلے آگاہی ہوئی ہے۔HSBC ایشیا کے چیف اکانومسٹ فریڈ نیومین کے مطابق ''مقداری آسانی کی بدولت ہمیں کچھ وقت تو میسر آگیا ہے لیکن سچائی یہ ہے کہ اس سے کوئی ایک

بنیادی مسئلہ بھی حل نہیں ہوسکا'' (فنانشل ٹائمز 20 ستمبر 2013ء)۔امریکی سینیٹ کی بینکنگ کمیٹی کے ریپبلکن رکن مائیک کرپیو نے کہا ہے کہ ''اس عمل کو جتنا طول دیا جارہا ہے، اتنا ہی ہماری بحران سے نکلنے کی صلاحیت پر تباہ کن اثرات مرتب ہورہے ہیں۔''

یہ تجربہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ سب ''جتنا لگاؤ گے اتنا واپس ملے گا'' کے قانون کے تحت کیا جارہا ہے۔ جتنی بھی بھاری رقم لگانے کی ضرورت ہوتی ہے، اتنے ہی بڑے نتائج کی امید بھی ہوتی ہے۔فنانشل ٹائمز کے چیف کالم نگار گیلان ٹٹ کے الفاظ میں ''اس پالیسی کے مرتب اور اس پر عمل کر کے مالیاتی نظام کو سنبھالنے کی کوشش کرنے والوں کی کیفیت کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ یہ ان کیلئے ایک طرف نئی چیز ہے تو دوسری طرف یہ بے یقینی سے بھرپور ہے۔'' ''ہم ایک ایسی دنیا میں رہ رہے ہیں کہ جس میں سرمایہ کاروں کا جوش، جذبہ، عادات، اعتماد اور اثاثوں کی قیمتیں دونوں سستی رقم پر انحصار کررہی ہیں۔'' جریدہ فنانشل ٹائمز اپنی 21 ستمبر 2013ء کی اشاعت میں اپنے اداریے میں امریکہ میں مقداری آسانی کے حوالے سے فیصلہ کن انداز میں لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ ''اگرچہ مقداری آسانی نے ہماری امیدوں کو تقویت بخشی ہے لیکن ان امیدوں کے برعکس یہ سب بے نتیجہ اور رائیگاں جارہا ہے۔ فنڈنگ لاگت کم ہونے کے باوجود سرمایہ کاری اندھے کنویں میں گرتی جارہی ہے۔ حکومتیں خسارے کم کرتی جارہی ہیں، تعمیراتی قرضے واپس ہو رہے ہیں، کارپوریشنیں کمائی کرتی جارہی ہیں۔ اسی طرح فیڈرل ریزرو کی جانب سے تخلیق کی جانے والی رقم، تعمیرات اور سرمائے کی سرمایہ کاری جیسی سرگرمی کو فنڈ نہیں کررہی۔ جس کی مدد سے ترقی کو براہ راست فائدہ بھی ہوتا۔ لیکن اس کی بجائے اس سرگرمی سے صرف موجود اثاثوں کی قدر میں ہی اضافہ ہورہا ہے۔''

تعمیراتی مالیات کے ادارے، فینی مے اور فریڈی میک، ویسے کے ویسے ہی ہیں جیسا پہلے تھے، مالیاتی قرضوں کی منڈی میں قرضوں کو بڑھاتے ہی چلے جارہے ہیں۔ بحران سے پہلے وہ امریکہ کی مالیاتی قرضے کی منڈی کے 60 فیصد حصے کو کنٹرول کرتے تھے، اب یہ حصہ 90 فیصد

تک پہنچ چکا ہے۔ یہی وہ کیفیتیں تھیں جو 2008ء کے انہدام کی بنیاد بنی تھیں۔ ایسے ہی خطرات کو سونگھتے ہوئے برنانکے نے جون 2013ء میں اعلان کیا کہ بینک مقداری آسانی کے سلسلے کو ختم بھی کرسکتا ہے۔ پال کروگ مین جیسے کئی کینیشن معاشی ماہرین اس سب کچھ سے بہت سہمے ہوئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ کوئی بھی جلد بازی، عالمی معیشت کو غلط پیغام دے سکتی ہے۔ نجی شعبے کی بحالی کسی محفوظ حالت میں جب تک نہیں پہنچ پاتی، تب تک مرکزی بینکوں کو کوئی سخت گیری نہیں دکھانی چاہئے۔ 38-1937ء میں ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔

برنانکے نے اس کے بعد اپنے موقف میں نرمی لاتے ہوئے ''اگر'' ''مگر'' کہنا شروع کردیا۔ اس نے بیان دیا کہ فیڈرل ریزرو، اثاثے خریدنے اس وقت بند کردے گا کہ اگر بیروزگاری کی شرح 7 فیصد سے نیچے آجائے تو۔ معیشت یہ ہدف پورا کرلے تو وہ سخت گیری سے گریز کرے گا۔ مختصر المیعاد قرضوں کیلئے شرح سود ایک لمبے عرصے کیلئے تقریباً صفر رہے گی۔ اس میں اضافہ ہوا تو وہ بتدریج ہوگا؛ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ سب کچھ کارِ رائیگاں رہا۔ بورژوازی کو مقداری آسانی اور سستے قرضوں کی لت لگ چکی تھی، ایسے ہی جیسے کسی نشہ کرنے والے کو ہیروئن کی لگ جاتی ہے اور جس کو سوائے روزانہ انجکشن لگانے کے کوئی چارہ نہیں ہوتا، کہ وہ زندہ سلامت رہ سکے۔ برنانکے کے ارشادات سامنے آتے ہی مالیاتی منڈی میں اتھل پتھل شروع ہوگئی اور بانڈز بیچے جانے شروع کردیے گئے جس سے ان کی قیمتیں کم ہونا شروع ہوگئیں۔ قرضے لینے کی لاگتیں بڑھتی گئیں۔ وسط ستمبر تک فیڈرل ریزرو کو اپنی پوزیشن سے پسپائی پر مجبور ہونا پڑ گیا۔ منڈی میں جشن شروع ہوگیا جب فیڈ نے اعلان کیا کہ وہ مقداری آسانی کے تیسرے مرحلے کیلئے راضی ہے۔

امریکہ میں بحران

2009ء میں، وائٹ ہاؤس میں قدم رکھنے کے دو ہفتے بعد صدر اوبامہ نے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''ہم کسی طور، پہلے کی طرح، اپنی معیشت کو ریتلی بنیادوں پر دوبارہ استوار نہیں کر سکتے۔ ہمیں لازماً ٹھوس بنیادوں پر معیشت کو تعمیر کرنا ہوگا۔ ہمیں تعمیر و ترقی کیلئے نئی بنیادیں قائم کرنا ہوں گی۔ ایسی بنیادیں جو ہمیں قرضے لینے اور پھر خرچ کرنے کے دور سے نکال کر ایسے عہد میں لے جائیں جہاں ہم بچت کر سکیں اور پھر سرمایہ کاری کر سکیں۔ جہاں ہم ملکی سطح پر کم خرچ کرنے کی عادت اپنائیں اور دوسرے ممالک کو زیادہ برآمد کر سکیں۔''

چار سال ہو چکے لیکن امریکی معیشت تا حال ریت ہی کی بنیادوں پر استوار چلی آ رہی ہے۔ اور جو آنے والے دنوں میں نئے بحرانوں کی زد میں آنے کو ہے۔ اس کا واضح اظہار ہمیں امریکہ کے مجموعی قومی قرضوں کی صورت میں نظر آتا ہے۔ امریکہ کی اس نازک کیفیت کا پتہ وہاں ہونے والے شٹ ڈاؤن سے چل جاتا ہے، جو امریکہ کو ڈبونے کو تیار ہو چکا تھا اور صرف امریکہ ہی نہیں پوری عالمی معیشت کی ٹانگیں اوپر کو اٹھ چکی تھیں۔ امریکی حکومتی قرضہ حیران کن حد تک 16.7 ٹریلین ڈالرز تک پہنچ چکا تھا، یہ وہ حد ہے جس کی کانگریس نے اجازت دی ہوئی ہے۔

بحران کی شدت کا اندازہ امریکی حکمران طبقات اور ان کے سیاسی نمائندگان میں پیدا ہونے والی واضح پھوٹ سے ہوتا ہے۔ عروج کے دنوں میں سرمائے کی نمائندہ دونوں پارٹیاں جو کہ اپنی اپنی جگہ امریکی سرمایہ داری کے دو مختلف دھڑوں کی نمائندہ ہیں، مختلف معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ مصالحت اور خیر اندیشی اپنائے رکھتی آ رہی تھیں۔ لیکن اب جبکہ صورتحال قطعی مختلف نوعیت

کی ہے اس لئے قدیمی سیاسی تانا بانا، سماج کی مزید ترقی یہاں تک کہ سرمایہ دارانہ نظام کی ترقی کے گلے کا پھندہ بننا شروع ہو گیا ہے۔ جس کے تباہ کن اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

امریکی قرضوں کی حد بڑھانے کا قضیہ، حکمران طبقات کے مابین پھوٹ کو ایک خطرناک مرحلے تک لے گیا، کیونکہ اگر اتفاق نہ کیا جاتا تو اس کا مطلب امریکہ کا ڈیفالٹ ہو جانا تھا۔ اس سے امریکہ کی مجموعی قومی آمدنی میں 6.8 فیصد کمی واقع ہو جاتی اور OECD میں پچاس لاکھ ملازمتیں بھی ختم ہو جاتیں۔ حالت یہ ہو چکی تھی کہ امریکی کانگریس میں ریپبلکن پارٹی کے دائیں بازو ٹی پارٹی کے ارکان جو کہ اوبامہ سے شدید نفرت کا شکار ہیں اور جو اپنی تنگ نظری کے سبب خسارے میں کمی کے مدعی بنے ہوئے ہیں، اس بات پر تیار تھے کہ امریکی اور عالمی معیشت کو منہدم ہو جانے دیا جائے۔

کینیشنسٹ معاشی ماہرین اس بات کے قائل ہیں کہ کسی بحران کے عین وسط میں معیار زندگی کو کم کرنے سے بحران شدید تر اور طویل تر ہو جائے گا۔ یہ بات درست ہے کہ جب تک صورتحال ایسی رہے۔ لیکن دوسری جانب مانیٹرسٹ کا بھی کہنا بجا ہے کہ کینیشنسٹ صاحبان کی خسارے کی سرمایہ کاری کی پالیسی افراط زر کو بڑھانے کا موجب بنتی ہے جس کا لازمی نتیجہ پہلے سے بدتر صورتحال کو مزید بدترین کرنا ہے۔

ایک سرمایہ دارانہ معیشت میں چند ایک شعبے ایسے ہوتے ہیں جو کہ نجی سرمایہ کاری کو کھینچتے ہیں جب شرح سود صفر کے قریب ہو اور جب ایک بہت بڑا پبلک خسارہ بھی موجود ہو۔ یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ جیف ساچز کہ جس نے مشرقی یورپ کے اندر نیولبرل ازم کو متعارف اور نافذ کرایا، اب یہ مطالبہ کرنے پر آ گیا ہے کہ اس وقت دنیا کو ایک نئی (New deal) سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے جیسی امریکی صدر روز ویلٹ نے 1929ء کے بحران کے بعد دی تھی۔ لیکن پھر اس قسم کے مطالبات دراصل بورژوازی کی اس بے بسی اور تعطل کی عکاسی کرتے ہیں جس کی زد میں وہ آ چکی ہے اور جس سے وہ نہ بچ پا رہی ہے نہ جان چھڑا پا رہی ہے۔ امریکی حکمران طبقات کے مابین پھوٹ اس مخمصے کی عکاس ہے کہ امریکی خسارے کو کم کرنے کیلئے یہ راستہ اپنایا جائے یا وہ، اور یہ خسارہ ایک ننگی تلوار کی طرح ان کے سروں پر لٹک رہا ہے جو کسی بھی وقت اپنا کام دکھا سکتی ہے۔

امریکی حکومت کے شٹ ڈاؤن نے دنیا بھر میں بورژوا حلقوں کے کان کھڑے کر دیے۔

عالمی بینک کے سربراہ جم یونگ کم نے اسے ایک ''انتہائی خطرناک لمحہ'' قرار دیا اور کہا کہ کسی بھی قسم کی ناسمجھی شرح سود کو بڑھا دے گی، اعتماد ختم کر دے گی اور ترقی مزید سست ہو جائے گی۔ آئی ایم ایف کی سربراہ کرسٹینا لیگارڈے نے اس سے بھی واضح انداز میں انتباہ کیا کہ امریکی ایوانوں میں تعطل دنیا کو ایک اور بحران میں دھکیل دے گا۔ اس دوران ڈالر دوسرے ملکوں کے مقابلے میں اپنی قدر کھونے لگا کیونکہ سرمایہ کار اپنا اعتماد ختم کر بیٹھے تھے۔

وفاقی بجٹ میں اخراجات خودکار Sequestration کے پاگل پن کی پالیسی کی وجہ سے سائنسی تحقیق، تعلیم اور انفراسٹرکچر پر سرمایہ کاری میں کٹوتیاں شروع کر دی گئیں۔ یوں ہر اس شعبے پر کٹوتیوں کے آرے چلائے جانے لگے کہ جن کی مدد سے امریکہ اپنے بجٹ خسارے کو کم سے کم شرح تک لے جا سکتا تھا۔ ریپبلکن نے مطالبہ کیا کہ اوبامہ اپنی صحت کے شعبے بارے میں مجوزہ اصلاحات سے دستبردار ہو جائے۔ امریکی کانگریس میں پیدا ہو جانے والا ڈیڈ لاک حکمران طبقات کے مابین پھوٹ کا نمایاں اظہار تھا، جسے وقتی طور پر ٹال تو دیا گیا ہے لیکن یہ ختم نہیں ہوا۔

اب بورژوا معاشی ماہرین کا ایک نیا حصہ اس بات کی وکالت پر اتر آیا ہے کہ ہمیں نیا طریقہ اپنانا چاہیے یا کٹوتیوں کی پالیسیوں کو ختم کر دینا چاہئے۔ ہمیں غریبوں کا سوچنا چاہئے کہ ان کا تحفظ کیا جائے۔ ان کی صلاحیتوں کو بڑھوتری دی جائے۔ ہمیں سرمایہ کاری کے بہاؤ کا رخ سبز توانائی کی طرف کرنا چاہئے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ بات بھلا کیسے مالکان، ریپبلکن اور مانیٹرسٹوں کو پسند یا وارے آ سکتی ہے! چنانچہ ان جیسی تجاویز کے ساتھ جو ہوا، اس کو یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ ایک انتہائی پرخطر پالیسی ہے جسے اپنایا جا رہا ہے اور جسے کچھ معاشی ماہرین 1938ء میں روز ویلٹ کو درپیش صورتحال سے مشابہہ قرار دے رہے ہیں۔ جب کانگریس نے اسے مجبور کیا کہ وہ کچھ اقدامات اٹھائے اور جس کے بعد صورتحال مزید گراوٹ کی طرف چلی گئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ روز ویلٹ کی نیو ڈیل پالیسیوں کی وجہ سے نہیں بلکہ دوسری عالمی جنگ کی بدولت ہی 1929ء میں شروع ہونے والے عظیم زوال کا خاتمہ ہوا تھا۔ لیکن یہ آپشن بھی اس وقت ناقابل عمل ہے کیونکہ

آج کا امریکی صدر شام پر بمباری کرنے کا حکم دینے کی جرأت سے بھی قاصر ہے۔

اپنی 2009ء کی تقریر میں اوبامہ نے ریت کی بنیادوں پر تعمیر نہ کرنے کا ذکر یونہی نہیں کیا تھا؛ ''اس کے بعد اچانک تیز بارش شروع ہوگئی؛ جو سیلاب بنتی چلی گئی؛ ساتھ ہی تند و تیز ہوائیں چلنی شروع ہوگئیں؛ اور ان ہواؤں نے گھر کی دیواروں کو ہلانا شروع کر دیا؛ اور پھر یہ گھر گر گیا؛ اور یہ گراوٹ کتنی عظیم الشان تھی۔''

یورپ کا بحران

بحران کی عالمگیر نوعیت کی وجہ سے یورپ کو کسی طور امریکہ سے الگ تھلگ نہیں کیا جا سکتا۔ امریکہ سے جاری ہونے والے اس اعلان کے بعد کہ وہ مقداری آسانی پر نظر ثانی کر سکتا ہے، یورپ کی مالیاتی منڈیوں میں فوراً ہیجان پیدا کر دیا۔ اور جس کے بعد یوروزون میں شرح سود بڑھا دی گئی۔ اس کے اثرات مانیٹری پالیسی کو مزید سخت کرنے کی شکل میں سامنے آئے وہ بھی ایک ایسی کیفیت میں کہ جب بحران اور بڑھتی ہوئی بیروزگاری کی موجودگی میں اس کے الٹ تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت تھی۔

بحران جس انداز میں اپنا اظہار یورپ کے اندر کر رہا ہے، ویسا کسی اور جگہ نہیں ہے۔ یورپی بورژوازی کا ایک مشترکہ سرمایہ دارانہ یورپ کا خواب ریت کے گھروندے کی طرح بکھر چکا ہے۔ سبھی قومی تضادات ابھر کر سطح پر آ چکے ہیں جو کہ مستقبل کو داؤ پر لگانے کیلئے تیار ہیں، نہ صرف یورو کا بلکہ خود یورپی یونین کا بھی۔

یورپ کو درپیش قرضہ کا بوجھ، ایک ایسا بھاری پتھر ہے جو یورپ کے گلے سے بندھ چکا ہے اور جو یورپ کو نیچے کی طرف جھکاتا اور کھینچتا چلا جا رہا ہے اور یہ یورپ میں کوئی حقیقی بحالی بھی نہیں ہونے دے رہا۔ کوئی ایک فرد ایسا نہیں ہے جو یہ بتا سکے کہ یورپی بینکوں پر قرضوں کا حقیقی حجم کس قدر ہے! یورپی بینکوں کے ''بُرے قرضوں'' کا حجم، کم از کم 1.05 ٹریلین یورو تک پہنچ چکا ہے جو کہ، وال سٹریٹ جرنل کے مطابق 2008ء کے مقابلے میں دوگنا ہے۔ لیکن یہ بھی صرف ایک

تخمینہ یا اندازہ بتایا جاتا ہے جبکہ حقیقی اعداد و شمار اس سے کہیں زیادہ ہوں گے۔ بہت سے سرمایہ کار بینکوں کا تخمینہ ہے کہ یورپی بینکنگ سیکٹر 2 سے 2.5 ٹریلین یورو تک سکڑنا چاہئے تاکہ مناسب حجم تک پہنچ سکے۔

جرمنی میں ایک سست رفتار بحالی کے آثار پیدا ہوئے ہیں لیکن سپین اور اٹلی ابھی تک اسی حال میں ہیں جبکہ یونان گہرے بحران میں ہے۔ بحران کی ابتدا کے بعد سے اٹلی اپنی مجموعی قومی آمدنی کا 9 فیصد جبکہ یونان کم از کم 25 فیصد گنوا چکا ہے۔ اگر یوروزون میں بحالی نہیں ہوتی تو جرمنی بھی ترقی کی طرف اپنا سفر نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ یوروزون ہی جرمنی کی برآمدات کی مرکزی منڈی ہے۔ یورپی یونین میں کاروں کی فروخت چوبیس سال پہلے 1990ء میں اپنے آغاز سے اب تک کی کم ترین شرح پر آ چکی ہے۔ 2013ء کے ابتدائی آٹھ میں سے چھ مہینوں میں یورپ میں کاروں کی فروخت مسلسل گرتی چلی گئی ہے۔

1999ء میں یورو کا اجراء کرتے وقت یہ اعلان کیا گیا تھا کہ یہ یورپ کی یگانگت، خوشحالی اور امن و استحکام کیلئے نکتہ آغاز ثابت ہوگا لیکن جیسا کہ ہم نے پیش گوئی کی تھی کہ ایک بحران کی کیفیت میں یہ یگانگت نہیں بلکہ قومی تنازعات اور انتشار کو جنم دے گا۔ اگرچہ یونان، اٹلی اور سپین جیسے ملکوں میں بحران کا سبب یورو نہیں ہے، جیسا کہ تنگ نظر قوم پرست سوچتے اور بیان فرماتے ہیں، لیکن اس کی وجہ سے یہ ممالک گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ضرور ہوئے ہیں۔

ماضی میں یہ ممالک اس قسم کے بحرانوں سے یوں بچ نکلتے تھے کہ اپنی اپنی کرنسیوں کی قدر کم کر دیتے لیکن اب یہ ناممکن ہو چکا ہے۔ غیر ملکی سرمایہ کاروں کی بدولت اپنی حصص کی منڈیوں کو تقویت دیتے ہوئے، اپنی کرنسی کی قدر کو کم کرنے کی بجائے ان ممالک کو مجبور کر دیا گیا ہے کہ یہ ''داخلی تخفیف'' (Internal Devaluation) کا بندوبست کریں یعنی وحشیانہ کٹوتیاں کی جائیں۔ لیکن یہ بھی کوئی کارگر تدبیر ثابت ہونے کی بجائے الٹا بحران کو گہرا کرنے کا موجب بن رہی ہے اور جس کی وجہ سے سماج میں طبقاتی تناؤ بہت شدید ہوتا چلا جا رہا ہے۔

سب سے زیادہ جس ملک کے بحران نے جلتی پر تیل کا کام کیا، وہ یونان ہے۔ جس کی وجہ سے یورواور یورپی یونین دونوں سنجیدہ خطرات کی زد میں ہیں۔ یہ ایک فطری امر تھا کہ بحران اپنا اولین اظہار یورپی سرمایہ داری کی کمزورترین کڑی سے کرتا۔ لیکن یونان کی بدحالی کے اثرات نے لامحالہ سارے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لینا تھا۔ یوروکا اجراء کرنے کے بعد میسر آنے والے معاشی ابھار کے بعد جرمنی کو موقع ملا کہ وہ سارے یورپ میں اپنی برآمدات کا جال پھیلا دے۔ جو ابتدامیں ایک مثبت سرگرمی تھی وہ اب ایک منفی کارستانی میں تبدیل ہوچکی ہے۔ ایک بار یورپین سنٹرل بینک کے سربراہ ماریو دراغی نے اعلان کیا تھا کہ وہ یورو کو بچانے کیلئے سبھی وسائل بروئے کارلائے گا لیکن موصوف یہ واضح کرنا بھول گئے کہ یہ وسائل آئیں گے کہاں سے؟

یوروزون کو بچانے کیلئے درکار کوئی بھی مالیاتی امداد یا وسیلہ ہمیشہ جرمنی کے ٹیکس دہندگان ہیں اور رہیں گے اور جن کی رقم ان کی بجائے کہیں اور خرچ کی جارہی اور کی جائے گی اور یہ بات انجیلا مرکل کیلئے ناخوشگواری کا باعث رہے گی۔ جرمنی شروع سے ہی کٹوتیوں اور مالیاتی سختیوں کو اپنانے کا دفاع کرتا چلا آرہا ہے۔ وہ خود یہ برداشت بھی کرسکتا ہے۔ وہ سارے یورپ میں سب سے بڑی معاشی طاقت ہے اور ایک معاشی طاقت کو یقینی طور پر اپنی سیاسی طاقت کا بھی مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ فرانس کا حکمران طبقہ جتنی بھی خوش فہمیوں کا شکار رہے یہ ایک حقیقت ہے کہ سبھی فیصلے جرمنی کے اختیار میں ہیں۔

تاہم ان سب کاوشوں کے باوجود کٹوتیوں کی پالیسیوں کی بھی اپنی حدود وقیود ہیں۔ جو سیاسی بھی ہیں اور سماجی بھی۔ یونان اور پرتگال جیسے ملک تو ان حدود وقیود کو پہنچ بھی چکے ہیں۔ جبکہ سپین اور اٹلی بھی قریب پہنچے ہوئے ہیں۔ بورژوازی کی سبھی خوش گمانیوں کے باوجود کچھ بھی نہیں بدلا۔ سب کچھ وہیں اور ویسے ہے۔ یوروزون کا بحران کسی بھی وقت دوبارہ اچانک پھٹ کر سامنے آسکتا ہے۔ پرتگال میں وحشیانہ کٹوتیوں کی پالیسیوں نے عوام کو مشتعل کردیا اور انہوں نے حکومت کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔ پرتگال کا پبلک خسارہ مسلسل بڑھتا چلا جارہا ہے۔ اندازہ ہے کہ یہ 2015ء تک اپنی کل آمدنی سے 130 فیصد بڑھ جائے گا۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ پھر کیوں اتنی

قربانیاں دی گئیں اگر اس کے باجود بھی اس اذیت سے دوچار ہونا تھا!

سیاسی عدم استحکام اپنا اظہار کئی ملکوں کے اندر غیر مستحکم مخلوط حکومتوں کے قیام اور عوامی رائے عامہ کے مشتعل ہونے کی شکل میں کر رہا ہے۔ اٹلی کے اندر انہیں طوعاً و کرہاً ڈیموکریٹک پارٹی کے ساتھ برلسکونی کا اتحاد تشکیل دینا پڑا۔ اور ان سب لیڈروں نے تقریباً سارا وقت ایک دوسرے کی خبر لینے اور الزام تراشیوں میں ہی صرف کئے رکھا۔ برلسکونی نے ایک ہی ہدف بنایا ہوا ہے کہ کوئی مقصد بھی پورا نہ ہونے دیا جائے۔ اٹلی کے رہنماؤں کے لئے کوئی سا بھی ایک عوامی ایشو دوسرے درجے کی اہمیت رکھتا ہے۔ اطالوی سرمایہ داری کی عمومی حالت یہاں کے حکمرانوں کی ترجیحات میں ہی نہیں ہے۔

بالائی سیاسی ڈھانچے میں نہ ختم ہونے والے باہمی تنازعات اور پھوٹ؛ کرپشن کے سکینڈل (سپین میں)؛ اپنے وعدے پورے نہ کرسکنا (فرانس میں)؛ اور سیاستدانوں کا اپنی جیبیں بھرتے رہنا (یونان میں) اور عوام کی سبھی اذیتوں اور محرومیوں کو پس پشت ڈالے رکھنے کا وطیرہ، سماج میں کرب اور بے چینی کو بڑھاوا دیے جا رہا ہے جس کی وجہ سے موجودہ سبھی پارٹیوں اور ان کی قیادتوں کے خلاف ایک نفرت پھل پھول رہی ہے۔ بورژوازی کیلئے یہ ایک انتہائی خطرناک کیفیت ہوتی جا رہی ہے اور وہ اپنے دستیاب متبادل سیاسی ذرائع کو استعمال کر رہی ہے تاکہ نظام کو بچایا اور چلایا جاسکے۔ سارے یورپ کے اندر ایک سیاسی اور سماجی بحران تیاری کے مراحل میں ہے۔

بورژوازی ایک گھن چکر میں پھنس چکی ہے جس سے وہ کسی طرح بھی نکل نہیں پا رہی۔ کٹوتیوں کی پالیسیاں کسی طور بھی معیشت کو بچانے اور چلانے میں کامیاب نہیں ہوسکیں۔ بہتری تو کجا ان پالیسیوں نے صورتحال کو پہلے سے بھی بہت بدتر کر دیا ہے۔ لیکن ان کے پاس کوئی اور متبادل بھی کیا ہے۔ آگے وحشی بلا کھڑی ہے تو پیچھے گہرا سمندر۔ یہ واضح نہیں ہے کہ کیا یورو زون مکمل ٹوٹ جائے گا، یہ وہ تناظر ہے جس سے بورژوازی بہت ڈری ہوئی ہے اور صرف یورپ کی ہی نہیں۔ مکمل انہدام سے بچنے کیلئے مالکان کو اپنی کچھ سخت گیر پالیسیوں سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ کچھ بھی ہو بالآخر یورپ کو متحد رکھنے کے تصور میں جان باقی نہیں رہے گی اور جو سرمایہ دارانہ

بنیادوں پر ممکن ہی نہیں۔

یورپی سرمایہ داروں کا مسئلہ سیدھا سادہ ہے اور وہ یہ کہ یورپی بورژوازی پچھلے پچاس سالوں کے دوران محنت کش طبقے کو ملنے والی کوئی رعائت بھی برقرار رکھنے کی پوزیشن میں نہیں، جسے اس نے اپنی جدوجہد سے جیتا تھا۔لیکن دوسری جانب محنت کش طبقہ بھی اپنے معیارِ زندگی کی حاصلات کو اتنی آسانی سے اپنے ہاتھوں سے نہیں نکلنے دے گا۔ہم ہر جگہ دیکھ رہے ہیں کہ معیار زندگی کو کم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے،اجرتیں کم کی جارہی ہیں،محنت کشوں کی ہجرتیں معمول بنتی جارہی ہیں،خاص طور پر جرمنی جیسے مغربی یورپ کے ملکوں میں۔لیکن اگر جرمنی ہی بحران کی لپیٹ میں ہوگا تو کیا ہوگا اور ہجرت کرنے والوں پر کیا بیتے گی!

دوسری عالمی جنگ کے بعد سے محنت کش طبقہ حیران کن سطح پر متحد ومضبوط ہوا ہے۔سبھی پسماندہ سماجی عوامل بہت کمزور ہوئے ہیں۔کسان جو کہ ماضی میں نہ صرف سپین، اٹلی، فرانس اور یونان میں بلکہ جرمنی میں بھی بڑی تعداد میں ہوا کرتے تھے،اب ایک کمزور اقلیت رہ چکے ہیں۔اساتذہ،سول سرونٹس اور بینک ملازمین جو کہ کچھ عرصہ پہلے تک خود کو مڈل کلاس سمجھتے آرہے تھے اور جو کسی بھی یونین کا حصہ بننے اور ہڑتالوں مظاہروں کا حصہ بننے کو پسند نہیں کرتے تھے،اب یہی مزدور تحریک کا سب سے پرجوش اور سرگرم حصہ بنتے چلے جارہے ہیں۔یہ بات طلبا کے حوالے سے بھی خوش کن ہے جو کہ 1945ء سے پہلے زیادہ تر دائیں بازو حتیٰ کہ فاشزم کا بھی حصہ ہوتے تھے لیکن اب ان کی اکثریت بائیں بازو کی طرف راغب ہورہی اور کئی مقامات پر تو یہ انقلابی قوتوں کا ہراول دستہ بھی بن رہے ہیں۔

ایک طویل عرصے سے یورپی محنت کش طبقے کو کسی بڑی سیاسی شکست کا سامنا نہیں ہوا اور اب بھی یہ کوئی آسان نہیں ہوگا کہ اس سے ماضی کی سبھی حاصلات واپس چھین لی جائیں۔ اکتوبر 2013ء میں بلجیم کے آگ بجھانے والے عملے کے افراد تمیں لاریوں پر سوار ہوکر پارلیمنٹ ہاؤس پہنچ گئے اور انہوں نے نہ صرف سبھی راستے بند کردیے بلکہ پولیس پر پانی اور فوم کا سپرے کیا

اور اپنا مطالبہ پیش کیا کہ قابل قبول حد تک سیکورٹی کیلئے مزید 57 ملین یورو فراہم کئے جائیں۔حکومت کو اس وقت یہ مطالبہ تسلیم کرنا پڑ گیا جب ریلوے کے محنت کشوں نے اپنے مزدور بھائیوں کے مطالبے کے ساتھ یکجہتی کرتے ہوئے ریلوے کو بلاک کر دیا۔محنت کشوں کی اس جرٔت اور جرأت نے طاقت کا توازن ہی بدل کے رکھ دیا اور حکمرانوں کو کٹوتیوں پر عمل پیرا ہونے کیلئے پسپائی پر مجبور کر دیا۔لیکن پھر بھی حکمران طبقہ اپنی پالیسیاں جاری رکھنے پر تلا ہوا ہے۔

جرمنی

بظاہر یہی لگتا ہے کہ جرمنی، بحران کے بدترین اثرات سے خود کو بچانے میں کامیاب رہا ہے لیکن ابھی کچھ بھی حتمی نہیں ہے۔ابھی باری لگنی ہے۔تاحال جرمنی کے اونچے قد کاٹھ کی وجہ اس کی برآمدات ہیں جن پر جرمنی کی معیشت تکیہ کئے ہوئے ہے۔2012ء میں جرمنی کی برآمدات اس کے جی ڈی پی کے 44 فیصد (1.1 ٹریلین یورو) تک پہنچ گئیں جو خاصی حیران کن تھیں۔اس بظاہر بڑی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ جرمن محنت کشوں کی اجرتیں اس سطح پر رکھی گئیں جو 1992ء میں ہوتی تھیں۔فنانشل ٹائمز کے مطابق ''مغربی یورپی ممالک میں تناسب کے اعتبار سے جرمنی وہ ملک ہے جہاں ورکروں کو سب سے کم اجرت دی جا رہی ہے''۔یہاں دس سالوں کے دوران عارضی کام کرنے والوں کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ ہوا ہے۔

جرمنی کی ترقی کا سارا دارومدار پچھلے سارے عرصے کے دوران کم تر اجرتوں اور بھاری سرمایہ کاری کا مرہون منت ہے۔جرمنی کے مزدوروں کی زیادہ سے زیادہ قوت محنت کشید کرنے کی صلاحیت نے جرمنی کو اپنے مدمقابل یورپی ملکوں میں ممتاز حیثیت فراہم کر رکھی ہے۔جیسا کہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار واضح کرتے ہیں؛

2000ء سے اکتوبر 2011ء تک کے دوران صنعتی پیداوار کا چارٹ

جرمنی؛ مثبت 19.7 فیصد

پرتگال؛منفی16.4فیصد

اٹلی؛منفی17.3فیصد

سپین؛منفی16.4فیصد

یونان؛منفی29.9فیصد

یہ حقیقت ہے کہ جرمن بورژوازی نے اپنے مدمقابل ملکوں کی کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھایا جو کہ صنعت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ان کا خسارہ جرمنی کی کامیابی بنتا چلا گیا۔ لہٰذا یورو صرف جرمنی ہی کیلئے سب سے زیادہ سودمند ثابت ہوا۔ جرمنی کے بینکوں نے ہنسی خوشی یونان کو قرضے جاری کرنے میں کوئی عار نہ سمجھی تا کہ وہ جرمنی کی مصنوعات خرید سکے۔ لیکن اب یہ عمل بھی الٹا پڑنا شروع ہو چکا ہے، ہر چند کہ یہ لوگ اس کا کھلے عام اظہار یا اعتراف نہیں کر رہے لیکن آئی ایم ایف کی افشا ہونے والی دستاویزات سے یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ ہم نے جو پہلے کہا تھا وہ درست ثابت ہوا ہے کہ یونان کیلئے بیل آؤٹ پیکجوں کا اس کے سوا کوئی مقصد نہیں ہے کہ جرمنی (اور فرانس) کے بینکوں کو بچایا جا سکے۔

دائیں بازو کے خود ساختہ یورپ نواز اب اٹھتے بیٹھتے یورو اور یورپی یونین کو برا بھلا کہتے چلے جا رہے ہیں لیکن جرمن سرمائے کے زیادہ سنجیدہ حکمت ساز محسوس کرنا شروع ہو گئے ہیں کہ ان کے پاؤں تلے سے زمین کھسکنا شروع ہو چکی ہے۔ وہ یہ بات سمجھ چکے ہیں کہ جب تک باقی یورپ بحران کی لپیٹ میں رہتا ہے، جرمنی کیلئے اپنا معاشی توازن قائم رکھنا محال ہے۔ چنانچہ جرمنی اپنی مصنوعات کہاں برآمد کرے گا؟

جرمنی کے شہر ہمبرگ میں ایک اہم معاشی میٹنگ کے دوران خطاب کرتے ہوئے جرمن ایس پی ڈی کے سابق سربراہ ہلمٹ شمٹ نے متنبہ کیا کہ ''یورپی یونین اور اس کی حکومتوں پر سے عوام کا اعتماد متزلزل ہو چکا ہے اور یورپ ایک انقلاب کے دہانے پر آ کھڑا ہوا ہے''۔ اس نے زور دیا کہ سماجی اور معاشی پیمانے پر بہت بڑی تبدیلیوں کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن یہ بات پھر سوالیہ اور تشنہ ہی رہ گئی کہ کس قسم کی تبدیلیاں ضروری ہیں اور یہ بھی کہ ان تبدیلیوں کو کون اور کیسے

یقینی بنائے گا؟

برطانیہ

کسی عہد میں زمانے بھر کیلئے ورکشاپ کا درجہ رکھنے والا برطانیہ اپنی صنعتی بنیادیں کھو چکا ہے اور اس وقت بری طرح سے مالیاتی سرمائے اور سروسز کے طفیلی پن کے تسلط میں آیا ہوا ہے۔ برطانیہ کے بینکار یورپ کے ہر دوسرے ملک سے زیادہ، دس لاکھ پونڈز سے بھی زیادہ سالانہ کمائی کر رہے ہیں۔ برطانیہ بھی بحالی کے دعوے کرنا شروع کر رہا تھا لیکن حقیقی صورتحال کچھ اور ہی بیان کر رہی ہے۔

لگ بھگ ڈیڑھ سو سالوں، 1860ء کے بعد سے برطانیہ معیار زندگی میں گراوٹ کی سب سے بڑی اور مسلسل کیفیت کی زد میں ہے۔ ایسے اشارے اور علامات موجود ہیں جن سے اندیشہ ہے کہ برطانیہ میں ان سے بڑے پیمانے پر فسادات برپا ہو سکتے ہیں جو کچھ سال پہلے یہاں ہوئے تھے اور جنہوں نے یہاں کے شہروں اور قصبوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ برطانیہ میں بیس لاکھ بچے بھوکے پیٹ سکولوں کو جاتے ہیں۔ اس انکشاف نے سماج کو ہلا کے رکھ دیا جس کے بعد حکومت کو گھبراتے ہوئے اعلان کرنا پڑا کہ پرائمری سکولوں کے سبھی بچوں کو مفت کھانا فراہم کیا جائے گا۔

برطانیہ میں سماجی رویوں میں بڑی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں، اسٹبلشمنٹ بارے احترام اور اعتبار کے قدیمی معیار اب یکسر الٹ چکے ہیں اور ان کی جگہ نفرت نے لے لی ہے۔ وہ لوگ جنہیں ماضی میں قدر و منزلت کا حامل سمجھا جاتا تھا، جیسا کہ ارکان پارلیمنٹ، صحافی، عدلیہ اور پولیس؛ اب یہ بداعتمادی اور توہین کا مرکز بن چکے ہیں۔

28 ستمبر 2013ء کے فنانشل ٹائمز میں جان میکڈرمٹ کا کہنا ہے کہ ''عوام یہ سمجھتے ہیں کہ اسٹیبلشمنٹ اپنی تہوں میں گل سڑ چکی ہے۔ 2010ء میں پالیسی ایکسچینج کے ایک جائزے میں یہ پتہ چلا کہ 81 فیصد برطانوی اس بیان کو درست سمجھتے ہیں کہ 'سیاستدانوں کو حقیقی دنیا کی قطعی طور پر

کوئی سمجھ بوجھ نہیں ہے'۔ جبکہ برطانیہ کے ادارہ برائے سماجی رجحانات نے اپنی سروے رپورٹ میں کہا ہے کہ صرف 18 فیصد شہریوں کو ہی اعتبار ہے کہ حکومتیں پارٹیوں پر عوامی ضرورتوں کو ترجیح دیتی ہیں۔ 1986ء میں اعتبار کی یہ شرح 38 فیصد تھی۔ 1983ء میں 90 فیصد شہری سمجھتے تھے کہ وہ درست طرز حکمرانی سے منسلک ہیں۔ جبکہ آج یہ شرح صرف 19 فیصد رہ گئی ہے۔ ادارے کے مطابق یہ اس کی تیس سالوں کے دوران سب سے حیران کن اور ڈرامائی سماجی تبدیلی ہے جو برطانوی شہریوں کے رویوں میں در آئی ہے۔''

''برطانوی کیونکر اپنے اداروں کے بارے تشویش میں مبتلا رہتے ہیں یہ سوال تو ملکہ معظمہ سے پوچھا جائے لیکن بینکنگ، پارلیمنٹ اور میڈیا بارے مسلسل اور متواتر سامنے آرہے سکینڈلوں کی وجہ سے عملی طور پر ایوانوں میں سرگرم طاقتوں پر اعتماد بلا مبالغہ منہدم ہو چکا ہے۔ طاقت کے حامل لوگوں کو کوئی پرواہ ہے نہ احساس کہ برطانیہ سمیت ہر جگہ کی اشرافیہ کے خلاف حقارت کتنی پختہ ہوتی جارہی ہے۔''

لیبر پارٹی کے قائد ایڈملی بینڈ کو چار و نا چار بات کرنے پر مجبور ہونا پڑا، اگرچہ بہت ملائم انداز میں سہی، اس نے بڑے کاروباروں اور بینکوں کے خلاف بڑھتے ہوئے غم و غصے کا ذکر کیا۔ نیچے پارٹی کے اندر سے شدید ترین دباؤ کے بعد ہی یہ بیان سامنے آیا۔ ملائم اور نرم ہونے کے باوجود بھی یہ بیان بورژوازی کو سخت ناگوار گزرا اور میڈیا میں ملی بینڈ کو آڑے ہاتھوں لیا گیا۔ فنانشل ٹائمز نے ملی بینڈ پر الزام لگایا کہ وہ مقبول ہونے کیلئے یہ سب ڈرامے بازی کر رہا ہے۔ یہاں ہم اس متضاد دباؤ کو ابھی سے دیکھ سکتے ہیں، جن کا، بحران کی حالت میں لیبر پارٹی کو اقتدار ملنے کے بعد سامنا کرنا پڑے گا۔

فرانس

جب یورپی یونین کی تشکیل کی جارہی تھی، تب اس کے پیچھے مرکزی خیال یہ تھا کہ یہ ایک ایسا

ادارہ ہوگا کہ جس کی سیاسی قیادت تو فرانس کے پاس ہوگی جبکہ جرمنی اس کی معیشت کو چلانے کا ذمہ دار ہوگا۔لیکن فرانس کی بورژوازی کے سبھی ارمان خیالی پلاؤ ہی بن کے رہ گئے۔سارے فیصلے برلن ہی کرتا ہے، پیرس نہیں۔

پچھلے الیکشن میں سوشلسٹ پارٹی نے ہر طرف اور ہر سطح پر واضح کامیابی حاصل کی۔لیکن اس کے بعد بہت ہی جلدی اور تیزی سے اولاندے کی مقبولیت ہوا میں تحلیل ہونی شروع ہوگئی۔کیونکہ ہر دوسرے اصلاح پسند لیڈر کی طرح اس نے بھی بحران کو سنبھالنے کا ذمہ لے لیا۔جس کے نتیجے میں اولاندے کی مقبولیت 1958ء کے بعد کسی بھی فرانسیسی صدر کی سب سے کم سطح پر پہنچ چکی ہے۔تازہ ترین سروے میں دائیں بازو کی لیڈر میرین لی پن مقبولیت میں آگے جبکہ اولاندے بہت پیچھے رہ گیا ہے۔

میڈیا یقینی طور پر اسے دائیں بازو کی طرف عوامی جھکاؤ قرار دے گا جبکہ درحقیقت یہ کیفیت مروجہ وموجودہ تمام سیاسی پارٹیوں بارے سماج میں پنپ رہی فرسٹریشن، بداعتمادی اور ''بائیں بازو'' کے حوالے سے ابہام کا اظہار ہے۔کہ جو وعدے وعید تو بہت کرتا لیکن ان پر عمل بہت ہی کم کرتا ہے۔یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ کیا فرانس کی کمیونسٹ پارٹی اپنی اصلاح پسندانہ پالیسیوں کے ساتھ، سوشلسٹوں یا ڈی گوشے فرنٹ کا اعتماد جیت سکتی ہے! یا یہ اپنی اولین انتخابی ساکھ بحال کر پاتی ہے؟

اندرونی مسائل سے اپنی اور لوگوں کی توجہ ہٹانے کیلئے اولاندے نے افریقہ (مالی اور سنٹرل افریقی جمہوریہ) میں عسکری جارحیت کا کھیل شروع کیا ہوا ہے۔یورپ میں جرمنی کی برتری کے باعث، اولاندے افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ میں اپنے سابقہ نوآبادیاتی دور کی عظمت کو بحال کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن فرانس میں اب وہ دم خم ہی نہیں ہے جس کی مدد سے وہ دنیا میں کہیں بھی اپنا کوئی آزادانہ رول متعین کر سکے۔حالیہ عسکری جارحیتیں بھی پچھتاوے پر منتج ہوں گی۔اور جو فرانس میں موجود سلگتی ہوئی بے چینی پر تیل چھڑکے گی۔

یورپ میں طبقاتی جدوجہد کے حوالے سے فرانس ایک اہم ملک کی حیثیت رکھتا ہے۔ فرانس کے محنت کش طبقے نے ایک نہیں کئی بار بلکہ ہر بار یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ اپنی انقلابی روایات کو کبھی نہیں بھولا۔عوام اپنے مسائل کے حل کیلئے راہ نجات تلاش کر رہے ہیں۔وہ اپنا اعتماد بھی سوشلسٹوں کو دیتے ہیں لیکن بدقسمتی سے یہ لوگ ہر سطح پر سرمایہ دارانہ نظام سے پیوست اور اس کے ڈھانچوں سے وابستہ ہو چکے ہیں۔بایاں بازو عوام کی امنگوں اور ضرورتوں کے ساتھ غداری کر رہا ہے۔

ہم جو کچھ صاف طور پر دیکھ رہے ہیں وہ سماج کے اندر طبقات کی واضح ہوتی پولرائزیشن ہے جو آگے کسی وقت اپنا سیاسی اظہار بھی کرے گی۔انتخابی عمل کے حوالے سے شکوک وشبہات کے مارے محنت کش اور نوجوان سڑکوں پر آسکتے ہیں جیسا کہ وہ پہلے کر چکے ہیں۔مئی 1968ء ایک بار پھر فرانس میں تیاری کے مراحل میں ہے لیکن اس بار اس کا رنگ روپ اس کا چال چلن پہلے سے کہیں بڑھ کر ہوگا کیونکہ اس وقت یہاں کوئی سٹالنسٹ پارٹی نہیں ہے جو طاقت یا اتھارٹی رکھتی ہو جس سے وہ اس تحریک کو دھوکہ دے سکے۔

اٹلی

اٹلی اپنی معاشی ساکھ کی تنزلی اور اپنے لیے ہوئے بانڈز پر بڑھتی ہوئی شرح سود کے باعث نیچے کی جانب جاتی ایک ڈھلوان پر گامزن ہے۔اور اس کے تباہ کن اثرات نہ صرف اٹلی بلکہ یورو زون پر مرتب ہوں گے،حکومت جس طرح سے اپنی قرضوں کی لاگت کو بڑھاتی چلی جارہی ہے، اس کی وجہ سے یہ اپنی معیشت کو مستقبل کیلئے مزید مصیبت میں ڈالتی جارہی ہے۔

بیروزگاری دن بدن بڑھتی چلی جارہی ہے۔پچھلے تین سالوں کے دوران دس لاکھ افراد اپنے روزگار سے محروم ہوئے ہیں جن کی عمریں 25 سے 34 سال تک تھیں۔35 سال سے کم عمر کے افراد میں،دس میں سے صرف چار ایسے ہیں جنہیں کوئی روزگار میسر ہے۔سرکاری طور پر تیس

لاکھ افراد بیروزگار ہیں لیکن بہت سے لوگوں نے تو روزگار کی تگ ودو ہی ترک کر دی ہے کیونکہ انہیں کوئی بھروسہ ہی نہیں رہا کہ روزگار ملے گا بھی۔ 2012ء میں نوے لاکھ افراد کو سرکاری طور پر غریب قرار دیا گیا جن میں سے 44 لاکھ انتہائی غربت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اٹلی کی سب سے بڑی سپر مارکیٹ کی چین لیگا کوپ کے کئے گئے ایک سروے کے بعد ان شواہد کی تحریری صداقت سامنے آ گئی جو ابھی تک سامنے نہیں تھے۔ اس کے مطابق تیس لاکھ گھر جو کہ آبادی کا 12.3 فیصد بنتا ہے، دو دنوں کیلئے اعلیٰ پروٹین کی حامل خوراک افورڈ نہیں کر سکتے۔ 90 لاکھ اطالوی اس قابل نہیں رہیں گے کہ وہ 800 یورو کے غیر متوقع اخراجات برداشت کر سکیں، اطالویوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد ایک کار استعمال کرنے سے قاصر ہوتی جا رہی ہے، جو کہ کل آبادی کا 25 فیصد بنتی ہے۔ چالیس لاکھ لوگ تعطیل سے لطف اندوز ہونے سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔ جبکہ آبادی کا 3 2 فیصد حصہ ایسا ہے جو نئے کپڑے خریدنے سے قاصر ہو چکا ہے۔ گزشتہ چار سالوں کے دوران خوراک پر اخراجات میں 14 فیصد کمی واقع ہوئی ہے۔ فی کس آمدنی (2400 یورو) 1971ء کی سطح تک گر چکی ہے۔

''فنانشل ٹائمز'' 7 اکتوبر 2013ء کو اٹلی کی حالت زار اور اس کو درپیش اہداف بارے لکھتا ہے کہ ''یہ معاشی طور پر جہاں سخت تکلیف دہ ہیں وہاں سیاسی طور پر خودکشی کے مترادف ہیں۔'' اطالوی سرمایہ داری جرمنی اور فرانس کا مقابلہ نہیں کر سکتی چنانچہ یہ پیچھے کی جانب گرتی چلی جا رہی ہے۔ ماضی میں یہ اپنی کرنسی کی قدر میں ردوبدل کر سکتا تھا لیکن جب سے یہ یورو سے جڑا ہے، یہ رستہ بھی بند ہو چکا ہے۔ اس کی بجائے البتہ یہ ''داخلی تخفیف'' کر سکتا ہے جس سے مراد ہے کہ معیار زندگی میں زیادہ سے زیادہ کمی کی جائے۔ لیکن اس کیلئے اٹلی کو ایک مضبوط حکومت درکار ہے جو بدقسمتی سے ممکن نہیں۔

اٹلی میں موجود ہر ایک پارٹی منتشر اور تقسیم ہے۔ PD میں دراڑیں ہیں جو کہ پرانے کمیونسٹ ڈھانچے اور کرسچن ڈیموکریسی کے بورژوازی کے حمایتیوں کے مابین ہیں۔ مونٹی کی چھوٹی سی پارٹی

بھی کئی حصوں بخروں میں بٹ چکی ہے اور امکان ہے کہ اس کا دھڑن تختہ ہو جائے گا اور یہ اگلے الیکشن میں 10 فیصد سے 4 فیصد تک آ جائے گی۔ یہاں تک کہ گوریلو کی ''فائیو سٹارز موومنٹ'' بھی انتشار کا شکار ہے اور اس کے بیشتر لوگ PD کے ساتھ اتحاد کے حق میں سرگرم ہیں۔

ٹریڈ یونین قیادت نے اٹلی کی قومی یکجہتی کی حامل حکومت کی حمایت میں انتہائی گھناؤنا کردار ادا کیا ہے، اور یہ حکومت کی ہر مزدور کش کٹوتی پالیسی کی تائید و حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ یہ بات خاص طور پر میٹل ورکرز یونین FIOM کی ''لیفٹسٹ'' قیادت پر صادق آتی ہے کہ جس نے پہلے تو اپنے مزدوروں کی امنگوں کو خوب جوش دیا لیکن پھر جس نے ان امنگوں کی خاک اڑاتے ہوئے CGIL کے لیڈر کا موسو کے ساتھ مل کر CGIL کی کانگریس کیلئے ایک مشترکہ دستاویز پر دستخط کر دیئے۔ یہاں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح بائیں بازو کا اصلاح پسند اپنا حقیقی کردار ادا کرتا ہے۔ دائیں بازو کے ٹریڈ یونین لیڈر بورژوازی کے ساتھ جڑ گئے اور بائیں بازو کے ٹریڈ یونین لیڈر، دائیں بازو کے ٹریڈ یونین لیڈر کے ساتھ جڑ گئے۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی محنت کش طبقے اور اس کے مسائل سے کوئی سروکار نہیں۔ محنت کش طبقہ ایک انتہائی کڑے وقت میں قیادت سے محروم ہے۔

قیادت کی غداری کچھ وقت کیلئے مایوسی اور شکست خوردگی کی کیفیت کو حاوی کر سکتی ہے۔ لیکن یہ کسی طور معاملے کا انت نہیں ہو سکتا۔ اپنے ہسپانوی، فرانسیسی اور یونانی محنت کشوں کی طرح اٹلی کے محنت کشوں کی بھی اچانک اور حیران کر دینے والی خود رو تحریکوں کی روایات موجود ہیں۔ اپنی روایتی تنظیموں کی جکڑ بندیوں کا شکار محنت کش طبقہ ایک دھماکے کی طرح اپنے غم و غصے کا اظہار کرے گا۔ جیسا اس نے 1969ء میں کر دکھایا تھا جب سردیاں محنت کش طبقے کی تحریک کی گرمی سے پگھل گئی تھیں۔ ابھی اس نومبر میں ہی ''جنووا'' ٹرانسپورٹ ورکرز کی طرف سے پانچ دنوں تک جاری رہنے والی کھلی ہڑتال اطالوی محنت کش طبقے کے حقیقی موڈ اور جذبے کی نشاندہی کرتی ہے۔ ایسی کیفیتیں بھی اٹلی کی صورتحال کا حصہ ہیں جبکہ اٹلی کی نوجوان نسل کے حوالے سے تو یہ بات اور بھی سچی ہے۔

سپین

بحران کے پانچ سالوں کے بعد 2013ء میں سپین کی معیشت میں مزید 1.04 فیصد گراوٹ آئی ہے۔ جبکہ یہاں بیروزگاری کی شرح ریکارڈ سطح پر پہنچی ہوئی ہے جو کہ اس کی کل ورک فورس کا 27 فیصد ہے۔ جبکہ نوجوان نسل میں یہ شرح دردناک حالت پر ہے؛ 57 فیصد۔ 2007ء کے بعد سے ساٹھ لاکھ روزگار تباہ ہو چکے ہیں۔ جس کے باعث ہزاروں کی تعداد میں نوجوان ملک سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔

کئی سالوں سے جاری بے رحمانہ کٹوتیوں کی پالیسیوں کے بعد اور باوجود بجٹ کا خسارہ ویسے ہی ضخیم ہے اور یہ اب بھی جی ڈی پی کا 6.5 فیصد ہے۔ جبکہ سپین کا قومی قرضہ اس کی جی ڈی پی کے 100 فیصد تک پہنچنے والا ہے۔ کٹوتیوں کے اقدامات کے ساتھ محنت کی منڈی میں کئی قسم کی رد اصلاحات بھی مسلط کی گئیں تا کہ سپین اپنے ہمسایہ یورپی ملکوں کے ساتھ مسابقت کی صلاحیت حاصل کر سکے۔ دوسرے الفاظ میں محنت کشوں کو سرمایہ داروں کے پیدا کردہ بحران کی ساری قیمت ادا کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اور یہ سارا کھلواڑ کرنے کا حاصل صرف ایک امید ہے کہ اگلے سال تک بحالی کے امکان پیدا ہو سکیں جس کا اندازہ 0.2 فیصد لگایا گیا ہے جو کہ 2015 میں 1 فیصد ہونے کا امکان ہے۔ حتیٰ کہ 2021ء تک بحران سے قبل کی سطح تک آنے کے امکانات نظر نہیں آ رہے۔

سچائی یہ ہے کہ عروج کے دوران لیے جانے والے کارپوریٹ، تعمیراتی اور ریاستی قرضے جو مجتمع ہوتے رہے تھے، کو ابھی تک نظام ہضم نہیں کر سکا۔ اور جب تک یہ نہیں ہوتا تب تک سپین کی سرمایہ داری کے اندر کسی بھی حقیقی بحالی کا کوئی امکان نہیں۔ بحالی بارے حالیہ توقعات کا سارا دارومدار برآمدات کی وصولیوں پر ہے اور جو تب تک مشکل ہیں جب تک یورپ اپنے بحران سے باہر نہیں آ جاتا۔ خوش گمانی کیلئے یہ بنیاد انتہائی کمزور ہے۔

معاشی بحران کے عوامی شعور پر مرتب ہونے والے اثرات اتنے شدید ہیں کہ جو طویل عرصے تک قائم رہیں گے۔اس معاشی بحران کے ساتھ ساتھ بدعنوانی کے جو سکینڈلز سامنے آرہے ہیں،ان کی وجہ سے بورژوا جمہوریت کے سبھی اداروں عدلیہ، بادشاہت، کانگریس اور حکمران پارٹی سب ان سے سخت متاثر ہورہے ہیں۔ہم جو کچھ یہاں سپین میں ہوتا دیکھ رہے ہیں وہ حکمرانی کا بحران ہے،فرانکو آمریت کے بعد سے بورژوازی نے جو ڈھانچہ کھڑا کیا تھا اور جس پر اپنی حکمرانی استوار کی تھی وہ اب لرز رہا ہے۔ماضی کی بہت سی خرافات واپس سماج میں در آرہی ہیں جس سے سپین کے کمزور اور قدامت پسند حکمران طبقے کو نپٹنا مشکل ہورہا ہے۔کیٹالونیا میں قومی مسئلہ پھر سے سر ابھار رہا ہے جسے معاشی بحران ہوا دیتا چلا جارہا ہے۔فرانکو آمریت کا شکار ہونے والوں کیلئے انصاف کا مطالبہ زور پکڑ چکا ہے اور جو سپین کی حکمرانی کے ڈھانچے کی رجعتیت کو عیاں اور اس کی جمہوریت پسندی کو بے نقاب کررہا ہے۔

عوامی مظاہروں کی ایک کے بعد دوسری لہر سپین میں ابھر رہی ہے۔خاص طور پر 2011ء کے بعد سے۔انڈگناڈوس کی تحریک، بے دخلی کے خلاف تحریک،کان کنوں کی جدوجہد،سرکاری ملازمین کی خودرو تحریک، 24 گھنٹوں کی دو عام ہڑتالیں وغیرہ وغیرہ۔لیکن پھر عوام ہمیشہ اور مستقل طور پر حرکت میں نہیں رہا کرتے۔تحریک میں اتار چڑھاؤ بھی آتے ہیں اور جمود بھی۔لیکن وہ غم وغصہ جو سماج میں نیچے تک پنپ چکا ہے اور جو اپنا کوئی واضح سیاسی اظہار نہیں کر پایا وہ ابھی تک موجود ہے اور جو کسی وقت بھی کسی بڑے دھماکے کو جنم دے سکتا ہے۔

پرتگال

پرتگال بھی پوری طرح سے بحران کی جکڑ میں آیا ہوا ہے اور کہا جارہا ہے کہ 2013ء میں اس کی جی ڈی پی کی شرح نمو 1.6 فیصد سے 2.7 فیصد کے دوران سمٹی رہے گی جبکہ 2014ء میں بھی بہت ہی نحیف ترقی کا امکان ہے۔بیروزگاری کی شرح ریکارڈ 16 فیصد پر پہنچی ہوئی ہے۔حکومت اس سال بھی خسارہ کم کرنے کا ہدف پورا نہیں کر پائے گی جو کہ جی ڈی پی

کے 5.5 فیصد تک لائے جانے کا ٹارگٹ ہے جبکہ حقیقی طور پر یہ شرح 6 فیصد رہنے کا احتمال ہے۔ 2010ء میں یورپی یونین کی جانب سے ملنے والے 78 بلین یورو کے بیل آؤٹ پیکیج کے باوجود بھی یہ حالت ہے۔

2014ء کے بجٹ میں بھی پبلک سیکٹر کی اجرتوں میں 2 فیصد سے 12 فیصد فی ورکر کٹوتی کی جارہی ہے، جبکہ 728 یورو مالیت کی کٹوتی پنشنوں میں بھی کی جارہی ہے۔ان کے علاوہ بھی مزید 3.3 بلین یورو لاگت کی کٹوتیاں درکار ہیں اور وہ بھی اس کیفیت میں کہ ایک اور بیل آؤٹ پیکیج بھی ملنا ہے۔ان اقدامات سے دائیں بازو کی حکومت کی حمایت منہدم ہو رہی ہے اور 2013ء کے مقامی انتخابات میں حکمران مخلوط پارٹیوں کو عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ فنانشل ٹائمز نوحہ کناں ہے کہ اس ملک میں سیاسی ماحول تباہی کے دہانے پر پہنچ رہا ہے۔

پرتگالی حکومت جس نے غلامانہ انداز میں اور اندھادھند طریقوں سے کٹوتیوں کی پالیسیاں مسلط کی ہیں، صبر وتحمل کی اپیلیں کرتی چلی آرہی ہے کہ ''مہربانی فرما کر ہمیں تھوڑا سا وقت اور دے دیں۔'' لیکن واشنگٹن، برسلز اور فرینکفرٹ میں بیٹھے مالیاتی خداؤں اور ٹرائیکا والے مزید وقت دینے کے موڈ میں نہیں۔ایک اور بیل آؤٹ پیکیج کیلئے مزید سخت کٹوتیاں کرنے کی شرائط لازم ہیں اور پھر جن کے ردعمل میں نئی اور شدید عوامی مزاحمت کا ماحول تیار ہو رہا ہے۔

پسوس ڈی کوئلو جسے جون 2011ء کے الیکشن کے دوران مرد آہن کے طور پر ابھارا گیا تھا، اور جو ٹرائیکا کا اپنے تئیں ذہین شاگرد قرار دیا جاتا تھا، اب وہ کمزور ترین لیڈر کے طور پر بدنام ہو چکا ہے۔اب وہ عوام کی نفرت کا استعارہ بن چکا ہے اور 17 جون 2013ء کی عام ہڑتال کے وقت اس کی حکومت منہدم ہونے کے قریب تھی۔دائیں بازو کی اس حکومت کے خلاف ہونے والے بڑے عوامی احتجاج کا یہ سب سے بڑا اظہار تھا۔

پرتگال کا محنت کش طبقہ 75-1974ء کی انقلابی روایات کو از سرنو دریافت کر رہا ہے۔ ستمبر 2012ء میں دس لاکھ افراد سڑکوں پر نکل آئے تھے اور پھر مارچ 2013ء میں پندرہ لاکھ

افراد۔مسئلہ قیادت کا ہے۔اپوزیشن کا کردار ادا کرنے والی سوشلسٹ پارٹی اپنی ساکھ گنوا چکی ہے کیونکہ اس نے اقتدار سے باہر آنے سے پہلے بیل آؤٹ پیکج پر دستخط کر دیے تھے۔لوگوں کے بیزار اور بے نیاز ہونے کی کیفیت میں ہی اسے معمولی عددی اہمیت حاصل ہے۔

اس عمومی عوامی بے چینی کا سب سے بڑا فائدہ کمیونسٹ پارٹی کو ہو رہا ہے۔لیکن SP کے ساتھ بائیں طرف موجود دونوں لیفٹسٹ پارٹیاں صورتحال کی مناسبت سے کسی سنجیدہ متبادل پروگرام سے ہی محروم ہیں۔Bloco de Esquerdaوالے ایک اصلاح پسندانہ کینیشنسٹ پوزیشن اپنائے ہوئے ہیں جس کے مطابق ایک ''سماجی یورپ'' کا قیام عمل میں لایا جائے جس میں سبھی قرضوں کا آڈٹ لازمی ہو۔جبکہ دوسری پارٹی PCPایک نیم سٹالنسٹ نقطۂ نظر کی وکالت کر رہی ہے جو کہ ایک محبِّ وطن اور جمہوری معیشت پر مبنی ہو اور جو یورو سے الگ تھلگ ہو۔

یونان

پانچ سالوں کی مسلسل بے رحمانہ کٹوتیوں کے بعد بھی یونان کا کوئی ایک مسئلہ حل تو کیا ہوتا، اس کے بالکل برعکس سبھی کی شدت میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ٹرائیکا کی اندھا دھند پالیسیوں نے ملک کو ایک اندھیر نگری میں بدل کے رکھ دیا ہے۔14 لاکھ افراد بیروزگاری کی دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں۔ہر تین میں سے دو نوجوان روزگار سے محروم ہیں۔جنگ کے بعد سے غربت کی شرح ناقابل تصور حد کو پہنچ چکی ہے۔

ایتھنز میں موجود حکومت بجا طور پر برسلز والوں سے شکوہ کناں ہے کہ اس کی جانب سے مسلط کی جانے والی کٹوتیوں کی وجہ سے یونان کی معیشت روز بروز زوال پذیر ہوتی جا رہی ہے۔ٹیکسوں کی آمدنی گراوٹ کا شکار ہے۔لیکن یونان والوں کی کسی بھی بات پر برسلز والے کان ہی نہیں دھر رہے۔جرمنی اور دوسرے قرض دینے والے کہہ رہے ہیں کہ جنوبی یورپ والوں نے اب تک اپنی اوقات سے باہر زندگی گزار دیکھی ہے،اب وہ ذرا اوقات میں رہنے

کی بھی عادت ڈالیں۔

کوئی بھی تحفظاتی پیکیج صرف تھوڑی سی دیر کیلئے ہی اپنے اثرات مرتب کرتا ہے لیکن اس سے منڈیوں کو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا۔ یونان کے بحران کا آخری اعلان ابھی آنا ہے، جسے ابھی موخر کیا جارہا ہے لیکن جسے آخر کار جلد یا بدیر ناگزیر طور پر سامنے آنا ہی ہے۔

اسی کیفیت میں ہی یونان سرمائے کے جواریوں کیلئے خوش قسمتی کا مرکز بنا ہوا ہے۔ فنانشل ٹائمز 11 اکتوبر 2013ء کو اس بارے اپنے ایک آرٹیکل Hedge funds profit in land of Greek opportunity میں حسب ذیل لکھتا ہے کہ ''یونان کا بینکنگ کا شعبہ وسیع ترین مفادات کا محور بنا ہوا ہے۔ پاؤلسن اینڈ کمپنی، باؤپوسٹ، یارک کیپیٹل، ایگل ویل اور اوش زف نامی کمپنیوں نے، الفا بینک اور پائریس بینک کو اپنے جبڑوں میں لیا ہوا ہے اور خوب منافع کمائے جارہی ہیں۔ جس قسم کے پاگل پن پر مبنی معاہدے کئے جارہے ہیں، اس سے یہ واضح ہے کہ یہ کمپنیاں یونان کے بینکوں کے حصص پر ہی غالب آجائیں گی۔''

یونان کی اس درجہ لوٹ مار، ٹرائیکا کی جابرانہ پالیسیوں اور معیار زندگی کے انہدام نے یونان کے اندر مسلسل ہڑتالوں، مظاہروں اور احتجاجوں کے ایک سلسلے کو بھڑکا دیا ہے۔ دو حکومتیں اس صورتحال میں گر چکی ہیں اور تیسری بھی گر سکتی ہے۔ سماراس ایک ایسی مخلوط حکومت کو بچانے کی سرتوڑ کوشش کررہا ہے جسے وہ سنبھال سکتا ہے نہ بچا سکتا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ فائدہ Syriza کو ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی Golden Dawn بھی زور پکڑتی جارہی ہے۔

گولڈن ڈان کے منظر عام پر آنے اور زور پکڑنے سے حساس طبیعت لوگوں کو یہ خدشات لپیٹ گئے ہیں کہ اس سے فاشزم کو فروغ ملے گا۔ لیکن جو کچھ اس کے ساتھ ہو چکا ہے، اس سے ہمارے اس موقف کو تقویت اور تصدیق ملی ہے جو ہم نے پہلے فاشزم کے حوالے سے لکھا تھا کہ اس موجودہ عہد میں فاشزم کا کیا کردار ہوسکتا ہے؟ یونان کی بورژوازی ایک مکروہ اور رجعتی کردار کی حامل ہے، چنانچہ اس کا ایک حصہ کوشش کرے گا کہ اگر ان کو موقع ملا تو اقتدار گولڈن ڈان کو دے دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یونانی بورژوازی کے سب سے رجعتی حصے (بحری جہاز تیار

کرنے والے)ہی گولڈن ڈان والوں کی دامے درمے سخنے امداد کر رہے ہیں۔

یورپ کے دوسرے ملکوں کے دائیں بازو کے برعکس جیسا کہ اٹلی میں فینی اور فرانس میں میری لی پن ہیں، اور جو خود کو اپنے اس ماضی سے الگ تھلگ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کے دوران وہ فاشزم کے حمایتی رہے تھے اور اس کی بجائے اب وہ ایک معزز پارلیمانی سیاست برتنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یونان کی گولڈن ڈان کے یونان کی پولیس اور فوج کے ساتھ تعلقات اب کسی سے بھی ڈھکے چھپے نہیں رہے۔ ان پاگل وحشی کتوں کا اپنا ہی ایک ایجنڈا ہے یعنی کسی نہ کسی طرح سے اقتدار میں آجانا۔

لیکن یہاں ایک مشکل ہے اور وہ یہ کہ یونان کا محنت کش طبقہ اس وقت بہت ہی منظم، متحد اور متحرک کیفیت میں ہے وہ لڑائی کے جذبے سے سرشار اور ناقابل شکست طاقت سے لیس ہے۔ بورژوازی کو اندیشہ ہے کہ ان کی کسی بھی قسم کی نامعقول حرکت جس سے فاشسٹ حکومت میں آگئے تو اس کے ردعمل میں محنت کش طبقہ ایک ایسی تحریک ابھار سکتا ہے جسے کنٹرول کرنا ان کے بس میں نہیں ہوگا۔ گولڈن ڈان کے غنڈے اتنے سر چڑھ گئے تھے کہ انہوں نے ایک لیفٹسٹ گلوکار کو قتل کر ڈالا جس سے وسیع پیمانے پر احتجاج بھڑک اٹھا۔ جس کے بعد یونان کی بورژوازی کو ان کے خلاف ایکشن لینے اور انہیں لگام ڈالنے پر مجبور ہونا پڑ گیا۔

بلاشبہ بورژوازی کسی طور بھی ان غنڈوں کا خاتمہ نہیں چاہے گی۔ عوام کے غم و غصے کو قابو میں کرنے کیلئے اگرچہ کچھ دکھاوے کے اقدامات کئے گئے ہیں لیکن یہ فاشسٹ عناصر کچھ وقت بعد کسی اور نام کے ساتھ سامنے آجائیں گے۔ ممکن ہے کہ یہ دائیں بازو کے کسی نیم نازی گروپ کی صورت میں منظر پر آجائیں۔ اسی دوران ہی لمپن پرولتاریہ کے سب سے انتہا پسند عناصر ریاست کے متشدد و جابر حصوں کی معاونت کیلئے سرگرم اور شریک رہیں گے (ان کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے)۔ یہ لوگ ہی ہڑتالیں توڑنے، چوری چکاری کرنے، مار پیٹ تشدد کرنے اور لیفٹسٹوں پر حملے کرنے کیلئے کام آتے ہیں۔

یونان کا فوری تناظر نہ تو فاشزم کا ہے نہ ہی بونا پارٹ ازم کا۔ بلکہ بائیں بازو کا امکان زیادہ ہے۔ سارا اس حکومت کا ناگزیر خاتمہ Syriza حکومت کے قیام کا امکان ہے لیکن جوں جوں سپر اس کے حکومت میں آنے کے آثار بڑھتے جا رہے ہیں توں توں اس کا لب ولہجہ بھی مصالحانہ ہوتا جا رہا ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ ووٹ لے سکے۔ لیکن جس کی وجہ سے یونان کے عوام کا اس پر اعتماد شک و شبہے کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ وہ بار بار کے سیاسی وعدوں سے ڈرے ہوئے ہیں جو دھوکوں میں تبدیل کر دیئے گئے۔ جن کو بھی ووٹ دیا انہی نے عوام کو مایوس کیا۔

یونان کے عوام کے حقیقی موڈ کا اندازہ اس تجزیے سے ہوتا ہے جو حال ہی میں ایک سروے کے بعد سامنے آیا ہے اور جس سے عیاں ہوتا ہے کہ یونان کے لوگ انقلابی نتائج اخذ کر رہے ہیں۔ اس تجزیے کے مطابق 63 فیصد یونانی، سماج میں ایک مکمل اور مستقل تبدیلی کے آرزومند ہیں، یعنی انقلاب کے۔ 23 فیصد نے تو براہ راست انقلاب کو اپنی ضرورت قرار دیا۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ عوام کو انقلاب کی ضرورت یا اہمیت کا ادراک نہیں ہے بلکہ المیہ اور سچائی یہ ہے کہ کوئی ایک بھی سیاسی پارٹی یا قیادت عوام کی ضرورتوں کا درست سیاسی اظہار کرنے کیلئے موجود نہیں جو وہ سماج کی تبدیلی کیلئے چاہ رہے ہیں۔

پچھلے چار پانچ سالوں کے دوران یونان کے محنت کش طبقے نے سماج کو بدلنے کیلئے متواتر اپنا بھرپور سیاسی اظہار کر کے دکھایا ہے۔ ایک کے بعد دوسری عام ہڑتال کی گئی۔ لیکن بحران اس قدر گہرا اور شدید ہو چکا ہے کہ اتنی ہڑتالیں اور اتنے مظاہرے بھی مسئلے کا حل نہیں کر سکے۔ آنے والے دنوں میں فیکٹریوں میں شکوک وشبہات بڑھنے کے بعد مزید چوبیس گھنٹوں کی عام ہڑتالیں سامنے آئیں گی۔ ہڑتالوں اور مظاہروں میں جکڑے ہوئے محنت کش طبقے کے پاس سوائے الیکشن میں جانے کے کوئی چارہ نہیں ہے۔ جلد یا بدیر وہ ایک لیفٹسٹ حکومت کو منتخب کریں گے۔ جس کے بعد Syriza کو ایک واضح چیلنج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یا تو انہیں ایک سوشلسٹ پروگرام دینا پڑے گا یا پھر انہیں گل سڑ چکی بدعنوان سرمایہ داری کی نگرانی کا فریضہ سرانجام دینا پڑے گا۔ یہ یونانی انقلاب کیلئے ایک نئے مرحلے کا آغاز ثابت ہوگا۔ جس سے یونان کے

مارکسسٹوں کیلئے نئے اور اہم مواقع کھلیں گے۔

''ابھرتی معیشتیں''(BRICS)

دوسری عالمی جنگ کے بعد سے عالمی معیشت کے فروغ کیلئے سب سے اہم کردار عالمی تجارت کا رہا ہے۔لیکن اب اقوام متحدہ کے ادارے Unctad نے قرار دیا ہے کہ اگلے کچھ سالوں کے دوران عالمی تجارت بہت سست روی کا شکار رہے گی جس کے ان ابھرتی ہوئی معیشتوں پر شدید اثرات مرتب ہوں گے جن کا سارا دارومدار ہی برآمدات پر چلا آرہا ہے۔

وہ ساری امیدیں اب ہوا ہو چکی ہیں کہ ایشیا عالمی سرمائے داری کیلئے انجن کا کام دے گا۔چین کی ترقی سست پڑ چکی ہے جبکہ انڈیا کی معیشت بھی تیزی سے گراوٹ کی طرف گامزن ہے۔ یورپی معیشت جمود کی زد میں ہے۔جاپان کا تناظر بھی کسی طور خوشگوار نہیں ہے۔ جاپانی حکومت اپنی معیشت کو رواں رکھنے کے لئے اس میں مزید پیسہ انڈیل رہی ہے۔لیکن یہ پالیسی انتہائی غیر مستحکم ہے۔جاپان کا حکومتی قرضہ اس کی جی ڈی پی کے 250 فیصد تک پہنچ چکا ہے۔

ایشیا اور چین کی سست روی کے باعث ان سے وابستہ سبھی امیدیں خاک میں مل چکی ہیں۔ ابھرتی ہوئی پانچوں معیشتوں (برازیل، روس، انڈیا، چین اور جنوبی افریقہ) سبھی کی ایک جیسی

کیفیت ہو چکی ہے۔ جبکہ جنوب مشرقی معیشتوں بارے آئی ایم ایف کی پیش گوئی بھی مایوس کن ہے۔ آئی ایم ایف اب ان ابھرتی ہوئی معیشتوں بارے قرار دے رہا ہے کہ یہ ''سٹرکچرل'' سست روی کی زد میں آچکی ہیں۔

اسی طرح سے ابھرتی ہوئی منڈیوں کی ترقی بھی ماند پڑ چکی ہے۔

سبھی نام نہاد ابھرتی ہوئی منڈیوں میں ترقی سست سے سست تر ہوتی چلی جارہی ہے اور اسے سمجھنا اتنا مشکل بھی نہیں ہے۔ اگر یورپ اور امریکہ خریداری نہیں کر رہے ہیں تو مطلب چین پیداوار نہیں کر سکتا۔ اور جب چین پیدا نہیں کرے گا تو پھر برازیل، ارجنٹائن اور آسٹریلیا جیسے ممالک اپنی اجناس برآمد نہیں کر سکیں گے۔

برکس ممالک کے اندر قدم رکھنے والی سٹے باز سرمایہ کاری اب ان ممالک سے باہر نکلتی جارہی ہے۔ جس کے باعث ان کی کرنسیوں کی قدر کم ہوتی جارہی ہے۔ انڈیا کا روپیہ ہو کہ انڈونیشیا کا، ارجنٹائن کا پیسو ہو کہ برازیل کا رئیل یا پھر جنوبی افریقہ کا رینڈ، ان سب کو تیز گراوٹ کا سامنا ہے۔ نائیجیریا کے وزیر خزانہ نے انتباہ کیا ہے کہ امریکہ کی جانب سے مقداری آسانی کو واپس لینے سے ابھرتی ہوئی معیشتیں ڈوب سکتی ہیں۔ ایسی بات ملائشیا کے وزیر اعظم نجیب رزاق نے بھی کہی ہے۔ اسی نے ہی یہ پیش گوئی کی تھی کہ سرمایہ امریکہ کی طرف واپس آنا شروع کر دے گا۔

مضبوط معاشی ترقی اور معیار زندگی میں اضافے نے گزشتہ ایک دہائی کے دوران طبقاتی کشمکش کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ لیکن اب برازیل اور ترکی میں ترقی جامد ہو چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سبھی ترقی پذیر ملکوں کے اندر ترقی اس قدر سست اور ماند پڑ چکی ہے کہ جس کی بدولت ایک پوری نوجوان نسل کیلئے محنت کی منڈی میں قدم رکھنا بہت مشکل ہو چکا ہے۔

چین

برکس ممالک کا بحران دراصل چین کی معاشی سست روی کی بدولت ہے۔ چین نے جب ابھرنا شروع کیا تھا تو بہت سے لوگوں نے اسے سرمایہ دارانہ نظام کے درخشاں مستقبل کی ضمانت سمجھنا شروع کر دیا تھا (ان میں کچھ خود کو مارکسسٹ کہلانے والے بھی شامل تھے)۔ لیکن چین کے

ابھارنے صرف سرمایہ دارانہ نظام کے اندرونی تضادات کو تیز کرنے کا ہی کام کیا۔ایک عرصے تک کیلئے تو چینی معیشت کی دھماکہ خیز ترقی نے عالمی سرمایہ دارانہ نظام کو آکسیجن فراہم کئے رکھی۔اب یہ عظیم الشان سہولت اپنی الٹ میں تبدیل ہوکر عظیم الشان جھنجلاہٹ بن چکی ہے۔چینی معیشت میں کی جانے والی بے تحاشا سرمایہ کاری نے بھاری مقدار میں سستی اشیا کی شکل میں اپنا اظہار کیا جسے چین سے باہر اپنے لئے منڈیاں درکار پڑتی گئیں۔عالمگیر سطح پر پیداوار کرنے والوں کیلئے چین کی سستی اشیا کی بھرمار نے ایک دہائی سے زائد عرصے میں زائد پیداوار کے بحران کو اور بھی شدید کیا ہے۔

دیہی علاقوں سے سستی محنت کی بے پناہ فراہمی، جدید مشینری اور تکنیک جسے بھاری ریاستی سبسڈی کی پشت پناہی حاصل تھی، ان سب عوامل نے مل کر چین کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ ایک طاقتور صنعتی بنیاد تعمیر کر سکے۔اس کیفیت نے دنیا بھر میں روزگار اور صلاحیتوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔جن ملکوں میں مقابلے کی صنعت اور صلاحیت تھی، وہاں فیکٹریاں بند ہوتی چلی گئیں۔چین سے سستی اشیا کے بہاؤ کی وجہ سے غیر ملکی کمپنیاں دہل کے رہ گئیں۔شروع شروع میں تو شرح منافع بہت ہی زیادہ تھا لیکن جیسا کہ مارکس واضح کرتا ہے کہ پھر جب دوسرے ملکوں کے سرمایہ دار اشیا کا ذخیرہ کر لیتے ہیں تو شرح منافع عمومی سطح پر واپس آجاتا ہے۔چین میں ہم اس وقت یہی ہوتا دیکھ رہے ہیں۔بے تحاشا ترقی کا دور اپنی حدود کو پہنچ چکا۔اب چین کو ویسے ہی مسائل کا سامنا ہے جو ہر ایک سرمایہ دار معیشت کا مقدر ہوتی ہیں۔

چین کی کم قیمت کی حامل اشیا نے قریب قریب ہر شعبے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔لیکن جونہی کسی ایک مخصوص صنعت کے حوالے سے عالمگیر پیداوار کی بھاری تعداد چین میں داخل ہوئی تو زائد صلاحیت جلد ہی پھلنے پھولنے لگی۔اب ان کے چینی معیشت کی اس زائد پیداوار (زائد صلاحیت) کی وجہ سے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے ہیں۔دنیا کی دوسری بڑی معیشت ایک بہت بڑے خطرے کی زد میں آچکی ہے۔

عالمی مالیاتی بحران کے دوران چین نے عالمی منڈی کو چلائے رکھنے کیلئے ایک بہت بڑے محرک پیکیج کی معاونت فراہم کی جس سے منڈی کو آکسیجن ملتی رہی۔اس کے نتیجے میں چینی

معیشت کو بھی بہت تقویت ملی اور جو 2009ء اور 2010ء میں 8.7 فیصد سے ترقی کر کے 10.3 فیصد کی شرح پر پہنچ گئی۔ کینیشینسٹ طرز معیشت کی تاریخ کا یہ سب سے بڑا تجربہ تھا۔ لیکن اب تضادات ابھر کر سامنے آ چکے ہیں۔ اب وہ سبھی صنعتیں جو کہ اس محرکاتی پیکیج سے مستفید ہوئی تھیں، جن میں فولاد سے لے کر جہاز رانی اور دھات پگھلانے تک شامل ہیں، زائد صلاحیت (جسے زیادہ بہتر الفاظ میں زائد پیداوار کہا جانا چاہئے) کے ہاتھوں مفلوج ہو کے رہ گئی ہیں۔ چینی معیشت میں پیدا ہونے والی سست روی بے تحاشا نقصانات کا باعث بنے گی اور جس کے نتیجے میں خاتمے کا ایک تکلیف دہ عمل ضرورت بن جائے گا۔

اپنی 17 جون 2013ء کی اشاعت میں فنانشل ٹائمز لکھتا ہے کہ ''کیمیکلز سے لے کر سیمنٹ اور فلیٹ سکرین ٹیلی ویژنوں تک چینی صنعت اشیا کی اس قدر فراوانی کا شکار ہو چکی ہے کہ جس کی وجہ سے چین کے اندر اور باہر منافعوں میں بہت کمی واقع ہوتی جا رہی ہے اور اس کمی کی وجہ سے چین کی کمزور ہوتی معیشت کی نقاہت اور بھی بڑھ جائے گی۔''

چین ایلومینیم اور سٹیل کی عالمی پیداوار کا تقریباً نصف جبکہ سیمنٹ کی پیداوار کا 60 فیصد پیدا کرتا ہے جبکہ پیداوار میں نیا ہونے والا اضافہ اس پر مستزاد ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک ایسی کیفیت میں ہو رہا ہے کہ جب معیشت سست روی کا شکار ہے اور برآمدات کی منڈیاں سکڑ رہی ہیں۔ اگرچہ چین کی فولاد کی صنعت اس وقت بامِ عروج پر ہے۔ اس کے باوجود بھی یہ اپنی پیداواری صلاحیت کا 80 فیصد ہی استعمال کر رہا ہے۔ صنعت سے وابستہ سربراہان اور متعلقہ افسران کا کہنا ہے کہ ہمیں ابھی مزید اس استعمال میں کمی لانا پڑے گی۔ تاکہ شعبے میں توازن کو واپس لایا جا سکے۔ صرف فولاد ہی نہیں سیمنٹ کا بھی یہی حال ہے۔ چین کی انٹر پرائز کنفیڈریشن کے مطابق پچھلے سال سیمنٹ کی دو تہائی پیداوار کو کام میں لایا جا سکا ہے۔

اوشا ہیلے نے 17 جون 2013ء کے فنانشل ٹائمز میں لکھا ہے کہ ''یہاں بے پناہ زائد صلاحیت موجود ہے جبکہ طلب اور رسد میں توازن کیلئے کوئی مناسب بندوبست نہیں ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں دی جانے والی سبسڈی یہاں کی کل صنعتی پیداواری آمدنی کے 30 فیصد کے لگ بھگ ہے۔ ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ بہت سی کمپنیاں سبسڈی نہ ملنے کے باعث دیوالیہ ہو جائیں گی۔''

''تقریباً ہر صنعتی ادارے کی سرمایہ کاری اور ترقی کے منصوبے اس اعتماد اور یقین کی بنیاد پر تشکیل دیے جاتے ہیں کہ حکومت کسی طور بھی شرح نمو کو 8 یا 9 فیصد سے کم نہیں ہونے دے گی۔ لیکن اب معاملات پہلے جیسے نہیں رہے۔ چین کی شرح نمو 7.5 فیصد تک گری اور پھر یہ 7.8 فیصد تک ابھری۔ اس ابھرنے کے باوجود یہ چین میں پچھلے 13 سالوں کی کم ترین شرح نمو ہے۔''

''آٹو موبائل کے شعبے میں زائد صلاحیت بہت زیادہ ہو چکی ہے۔ مثال کے طور پر Geely جس نے 2010ء میں Volvo کو خریدا تھا، اس کمپنی کے 2011ء کے نقد منافعے براہ راست سبسڈی سے ہی حاصل ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سال Geely کو سبسڈی سے ملنے والی آمدنی کی شرح، Fathom China کے تجزیے کے مطابق، اس کے دوسرے بڑے منافع بخش ذریعے، سکریپ کی فروخت سے حاصل ہونے والے منافعوں سے 15 گنا زیادہ رہی۔''

چینی معیشت میں بڑھی ہوئی زائد پیداواری صلاحیت اور کم ہوتی شرح نمو یہ عندیہ دیتی ہے کہ بہت زیادہ تعداد میں لوگ دیوالیہ ہوں گے۔ جس کے لامحالہ چین کے ہر طبقے کے لوگوں کی نفسیات پر بہت شدید اور گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔

طبقاتی جدوجہد کا تناظر

چینی معیشت کی سبھی کامیابیاں اور کامرانیاں چین کے محنت کشوں کی ہی مرہون منت ہیں جو کہ وکٹوریہ عہد کے برطانیہ کے محنت کشوں کی طرح انتہائی نامناسب کم اجرتوں پر کام کرنے پر مجبور چلے آ رہے ہیں۔ جس نوعیت کی نابرابری چین میں ہے وہ دنیا میں کہیں اور نہیں ہے اور جسے اپنے تئیں سوشلسٹ چین سمجھا اور قرار دیا جاتا ہے۔ چین کے اندر ایک نئی بورژوازی پیدا ہو چکی ہے اور وہ بھی اس قسم کی مراعات سے لیس ہے کہ جس کا آبادی کا بہت بڑا حصہ تصور تک بھی نہیں کر سکتا ہے۔

چین پر ایک انتہائی چھوٹی لیکن ایک انتہائی غیر معمولی امیر ترین اقلیت کا تسلط ہے جو ایک طرف ریاست کو کھا رہی ہے تو دوسری طرف یہ چین کے محنت کشوں کا بھی بدترین استحصال کرتی

چلی آرہی ہے۔لیکن چین کے سرمایہ دار طبقے کی بنیادیں انتہائی خستہ ہیں۔ڈیڑھ ارب کی آبادی کے ملک میں کروڑ پتیوں (امریکی ڈالروں کے حوالے سے) کی تعداد 1.2 ملین ہے جو کہ کل آبادی کا 0.1 فیصد ہے۔ان کروڑ پتیوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے لیکن اس سے صاف واضح ہوتی ہے کہ چین کی سرمایہ داری کس قدر کمزور ہے۔یہ تعداد اٹلی یا برطانیہ میں موجود کروڑ پتیوں کی مجموعی تعداد سے بھی کم ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے نیچے ان سے کم لوٹنے والے؛ فیکٹری منیجروں، ڈائریکٹروں، فورمینوں، انجینئروں، افسر شاہی اور دیگر عمال کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو کہ ریاست اور پارٹی کے اداروں پر براجمان ہے۔اپنے اپنے خاندانوں کے ساتھ مل کر یہ لوگ ایک اسٹیبلشمنٹ تشکیل دیئے ہوئے ہیں۔لیکن اس سب کو مدنظر رکھنے کے باوجود بھی آبادی کی ایک بہت بڑی اکثریت نہ صرف معاشی دولت سے محروم ہے بلکہ اس طاقت سے بھی جو اس کی بدولت میسر آتی ہے۔ دولت کے اس بدترین ارتکاز کے حامل امیروں ،ان کے امیرزادوں اوران کی امیرزادیوں کوعوام کی جانب سے مسلسل حقارت اور مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے۔اورخاص طور پر اس کیفیت میں کہ جب چین کو''سوشلسٹ'' ملک تصور کیا جاتا ہے۔ ہر ادارے میں ہر سطح پر ہونے والی مکروہ ترین بدعنوانی نے اس حقارت ونفرت کواور بھی شعلہ انگیز بنایا ہوا ہے۔

چند ایک انتہائی بدعنوان افسروں کو پھانسی کی سزاؤں کا بھرپور پروپیگنڈہ کر کے ان کوعبرت کا نشان بنانے کی مہم درحقیقت اس لئے مشہور کی جاتی ہے کہ ان کی مدد سے عام چینیوں کے غم وغصے کو کم کیا جائے۔جبکہ اس سے یہ بھی کوشش کی جاتی ہے کہ بدعنوانی کی شرح کو بھی روکا جاسکے لیکن جو کہ ایک افسر شاہانہ ومطلق العنان طرز کی حکمرانی کا لازمی حصہ ہوا کرتی ہے۔اور جس میں اس کا حکمران طبقہ اوراس کے دلال،محنت کش عوام کی پیدا کردہ دولت کو لوٹتے کھسوٹتے رہتے ہیں۔

محنت کشوں کی نئی نسل کسی طور بھی تیار نہیں ہے کہ وہ کم اجرتوں اور خراب صورتحال میں کام کرے، جسے بدحال دیہاتوں سے آنے والی محنت کشوں کی پرانی نسل کے محنت کش کام ملنے کی غرض سے قبول کرلیا کرتے تھے۔چینی سماج میں اضطراب کی کیفیت کا اندازہ چین میں ہونے والی کام کی جگہوں پر ہڑتالوں،مظاہروں اور خودکشیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے ہوتا ہے۔یہاں

احتجاج کو سختی سے کچل دیا جاتا ہے اور جہاں چند ایک ہی حفاظتی قانونی حقوق میسر ہیں۔اس کیفیت میں چین میں بغیر کسی پیشگی انتباہ کے کسی بھی وقت اچانک بڑے دھماکے ہو سکتے ہیں۔یہ کسی طور کوئی حادثہ نہیں ہے کہ چین کی حکومت پہلی بار اپنے بیرونی دفاع سے کہیں زیادہ اپنے اندرونی دفاع پر خرچ کر رہی ہے۔

روس

یورپ کی بیشتر ریاستوں کی مانند روس کو قرضوں کے مسئلے جیسی سنجیدہ الجھن کا سامنا نہیں ہے۔اور یہ سب تیل اور گیس کی برآمدات اور اس کی وجہ سے ہونے والی ترقی کے طفیل ہے اور جس کی مدد سے پچھلے کچھ عرصے کے دوران اس کے مالیاتی ذخائر مستحکم ہو چکے ہیں۔لیکن اب اس کی بھی حدود ختم ہو چکی ہیں۔دوسرے برکس ممالک کی طرح سے روسی معیشت بھی لگ بھگ 1 فیصد کی کم شرح نمو کے ساتھ تنزلی کی طرف گامزن ہو چکی ہے۔

روس میں محنت کشوں کے علاوہ، پیٹی بورژوازی میں جنم لینے والے حالیہ اضطراب کے پس منظر میں یہی عنصر موجود ہے۔اور جو پیوٹن مخالف اپوزیشن میں شدید اضافے کا موجب بن رہا ہے۔کریڈٹ میں بے تحاشا فروغ کے باعث محنت کشوں اور نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اب خود کو قرضوں کے ایک بہت بھاری پتھر تلے دبی ہوئی محسوس کرتی ہے۔ایسی ہی کیفیت کمپنیوں اور ملٹی نیشنل اداروں کی بھی ہو چکی ہے۔جس کا نتیجہ سرمایہ کاری میں گراوٹ اور معاشی جمود کی صورت میں برآمد ہو رہا ہے۔پہلی بار آٹو موٹیو صنعت سمیت معیشت کے شعبے اپنی مصنوعات کی فروخت کے حوالے سے خود کو مشکلات میں گھرا ہوا محسوس کر رہے ہیں۔

ریاست کی طرف سے انفراسٹرکچر اور سوچی اولمپکس سمیت فیفا ورلڈ کپ جیسے منصوبوں میں براہ راست سرمایہ کاری جیسے کینیشینسٹ طریقوں سے معیشت کو سنبھالنے اور چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔اہرام مصر کی طرز کے ان دیوہیکل منصوبوں کی تعمیر و تکمیل کیلئے لازمی طور پر سستی محنت کا بدترین استحصال کرنا اور تیل و گیس کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کو بروئے کار لانا ہوگا۔تاہم ایک لمبے

عرصے کیلئے تیل کی بڑھی ہوئی قیمتیں امریکہ میں تیل کی پیداوار کی نئی ٹیکنالوجی کیلئے بہت زیادہ مسائل پیدا کر دیں گی۔ پیوٹن کا ''امپیریل انرجی'' پروجیکٹ ایک بہت بڑی غلطی بن چکا ہے۔ بحیرۂ منجمد میں پیوٹن کا گرین پیس کے ساتھ روا رکھے جانے والا رویہ اس کی طاقت کا نہیں بلکہ اس کی کمزوری کا واضح اظہار تھا۔

پچھلے عرصے میں معیشت کی مضبوطی نے پیوٹن کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ ایک پدرانہ طرز حکمرانی اپنا سکے اور جس سے اس کی حکومت کے مضبوط ہونے کا تاثر بھی ابھرا۔ لیکن پھر کوئی کیفیت لمبے عرصے کیلئے برقرار نہیں رہتی۔ نئے ورکروں کی اکثریت کو کم اجرتوں اور بدتر معیار زندگی کا سامنا ہے۔ وسط ایشیا سے روس میں قانونی و نیم قانونی تارکین وطن ورکروں کی بڑی تعداد آ رہی ہے۔ سیاسی اور سماجی استحکام میں اب اضطراب اور بے چینی کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ اور اسی سے ہی پیوٹن کا مقدر بھی منسلک ہے اور اس کی اپوزیشن کا بھی۔

پیوٹن کی لبرل اپوزیشن کا بنیادی مقصد اور ہدف پیوٹن کو میسر پیٹی بورژوازی کی حمایت کو اپنی طرف راغب کرنا ہے۔ اس وقت اپوزیشن کا مرکزی رہنما الیکسلے نوالینی ہے۔ ستمبر 2013ء میں ماسکو کے میئر کے الیکشن میں اس نے پیوٹن کے امیدوار سوبیانن کے 51 فیصد ووٹوں کے مقابلے میں 27.24 فیصد ووٹ حاصل کئے تھے۔ جبکہ کمیونسٹ پارٹی اور پارٹی کے ''لیفٹ'' ونگ لیڈر، ایوان میلنیکوف نے صرف 10.69 فیصد ووٹ لئے تھے۔ نوالینی جو کہ ایک وکیل اور چھوٹا سرمایہ کار ہے، کو لبرل پارٹی یبلوکو (Yabloko) سے قوم پرستی کی وجہ سے نکال دیا گیا تھا۔ اس کا موجودہ پروگرام بدعنوانی کے خاتمے، سستی حکومت، کم ٹیکسیشن، سابقہ وسط ایشیائی ریاستوں کیلئے ایک ویزا اسکیم جاری کرنا اور غیر قانونی طور پر مقیم غیر ملکی ورکروں کو ملک سے بے دخل کرنا ہے۔

روس میں سرمایہ داری کے دوبارہ احیا کی بدولت دولت کے ارتکاز کی شرح میں بے تحاشا اضافہ ہو چکا ہے۔ Credit Suisse Wealth کی رپورٹ ہمیں واضح طور پر بتاتی ہے کہ کس طرح ڈالروں میں کروڑ پتیوں کی بہت بڑی تعداد امریکیوں پر مبنی ہے اور یہ بھی کہ ان کے ہاتھوں میں کس قدر دولت مرتکز ہو چکی ہے۔

لیکن اسی رپورٹ میں ہی یہ بھی نمایاں طور پر بتایا گیا ہے کہ کچھ چھوٹے کیریبین ممالک کے معدودے ارب پتیوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے، روس بھی اب دولت کے حوالے سے نابرابری میں عالمی سطح پر آگے جا چکا ہے۔ عالمی سطح پر ارب پتی افراد کل دولت کے 1 سے 2 فیصد کی ملکیت رکھتے ہیں۔ آج روس کی مجموعی دولت کا 35 فیصد روس کے 110 ارب پتیوں کی ملکیت ہے۔

معاشی ترقی کی بدولت کچھ عرصے کیلئے وقتی اور عارضی طور پر طبقات کے مابین تنازعے میں شدت کم ہو چکی تھی لیکن اب یہ پھر سے تیز ہونا شروع ہو چکی ہے۔ سرمایہ داری کا عمومی عالمی بحران اس کو واضح آشکار کر رہا ہے۔ بحران سے قبل روس کی شرح ترقی 5 سے 8 فیصد سالانہ تھی مگر جو اب آئی ایم ایف کے بقول 1.5 فیصد کے لگ بھگ ہے۔ روس کے اندر سماجی صورتحال ایک دھماکہ خیز کیفیت میں داخل ہونے جا رہی ہے اور وہ بھی کم مدت میں۔

لینن نے قرار دیا تھا کہ انقلاب کیلئے درکار شرائط میں ایک یہ بھی ہوتی ہے کہ حکمران طبقات بحران کی ایسی حالت میں ہوں کہ جب وہ پرانے طور طریقوں سے حکمرانی کرنے سے قاصر ہو چکے ہوتے ہیں۔ روسی اسٹیبلشمنٹ ایک بیزاری اور مایوسی کی حالت میں ہے بلکہ ایک کربناک کیفیت کا شکار ہے۔ پیوٹن کوشش کر رہا ہے کہ حالات کے پھٹنے سے پہلے روس کو ایک مضبوط پولیس سٹیٹ میں بدل دے۔

انقلاب کیلئے لینن نے جس دوسری کیفیت کو شرط قرار دیا تھا وہ درمیانی پرتوں میں اضطراب کی شدت تھی، اور جو انقلاب اور ردانقلاب کے مابین لڑھکتے لٹکتے رہتے ہیں۔ عوامی مظاہرے جو کہ الیکشن نتائج کے خلاف سامنے آتے رہے بنیادی طور پر مڈل کلاس کردار کے حامل تھے اور یہ مظاہرے وضاحت کرتے ہیں کہ یہ دوسرا عنصر بھی سرگرم ہو چکا ہے۔

تیسرا عنصر جس کی نشاندہی لینن نے کی تھی وہ یہ تھی کہ محنت کش جدوجہد میں اتریں اور سماج کو بدلنے کی تگ ودو کریں۔ یہ عنصر ابھی روس کے اندر واضح پختگی کے ساتھ سامنے نہیں آیا۔ لیکن معاشی ابتری کے تسلسل اور پیوٹن کے حوالے سے بڑھتی ہوئی بے اطمینانی کی صورتحال اس بات کا

اظہار کرتی ہے کہ روس میں ترکی اور برازیل جیسے سماجی دھماکے اتنے دور نہیں رہے اور کسی بھی وقت ممکن ہو سکتے ہیں۔

مسئلہ صرف ایک ہے اور وہ قیادت کا ہے۔ نام نہاد کمیونسٹ پارٹی کا عوامی مسائل کے حوالے سے کوئی بھی سنجیدہ پروگرام نہ دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ احتجاجوں اور مظاہروں کو لبرل اور پیٹی بورژواڈیموکریٹس کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے۔ لیکن پھر یہ تحریک ایک عمومی عوامی بے چینی کی علامت ہے جو آگے چل کر جلد یا بدیر ایک سماجی دھماکے میں سامنے آئے گی۔ مڈل کلاس اور طالب علموں کی ریڈیکلائزیشن روس میں موجود بحران کے شدید ہونے کا بیرومیٹر ہے اور جو ایک دھماکہ خیز کیفیت میں داخل ہونا چاہ رہی ہے۔ وقت آنے پر روس کا محنت کش طبقہ اپنی طاقت کو از سرنو دریافت کرتے ہوئے اکتوبر انقلاب اور بالشوازم کی درخشندہ حقیقی روایات کو اپنائے گا۔

بھارت اور پاکستان

بھارت کی بورژوازی عظمت اور برتری کے ایک خبط کا شکار چلی آ رہی ہے۔ وزیراعظم من موہن سنگھ نے قرار دیا تھا کہ ہندوستان کی معاشی ترقی کا جہاز 8 سے 9 فیصد کی رفتار سے دوڑ رہا ہے لیکن اب جس کی رفتار نصف کم ہو چکی ہے۔ نجی سرمایہ کاری گم ہو چکی ہے۔ افراط زر 10 فیصد سے زیادہ ہو چکا ہے۔ 2013ء کے تین مہینوں جون سے اگست کے عرصے کے دوران روپیہ کی قدر 13 فیصد کم ہو چکی ہے۔ جریدہ ''اکانومسٹ'' 24 اگست 2013ء کی اپنی اشاعت میں لکھتا ہے ''وہ سبھی مہان ومہاتما ماہرین جو کہ ایک چمکتے ہوئے بھارت کا واویلا کرتے چلے آ رہے تھے، اب ایک سماجی بے چینی کا انتباہ کرنا شروع ہو چکے ہیں۔''

یہ پیش گوئی ایک حقیقت بن کر سامنے آنا شروع ہو گئی ہے۔ مختلف عوامی مسائل کے گرد ہونے

والے بڑے مظاہروں کا سلسلہ اسی کیفیت کی غمازی کرتا ہے۔ پہلے بدعنوانی کے خلاف مظاہرے ہوئے، جس کے بعد خواتین کے ساتھ زنا بالجبر اور ان کے قتل کے واقعات کے خلاف مظاہرے ہوئے ہیں۔ ہر دو قسم کے مظاہرے اپنی نوعیت میں پیٹی بورژوا ہیں لیکن یہ واضح طور پر قدامت پسند ہندو قوم پرست بھارتی ریاست کے خلاف سماج میں پھلتی پھولتی بے چینی کا اظہار ہیں۔

یہ سمندر کی وہ لہریں ہیں جو کہ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ نیچے سمندر میں کس قدر اضطراب پنپ رہا ہے۔ بھارت کی معیشت میں ہونے والی ''ترقی'' سے محروم عوام کی بڑھتی ہوئی بے چینی دھیرے دھیرے ایک غم و غصے میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ پچھلے عرصے میں کسانوں کی سرکشیوں اور سب سے بڑھ کر فروری 2013ء میں ہونے والی دو دنوں کی عام ہڑتال اس کیفیت کی ہی عکاسی کرتی ہے۔

دوسری جانب ایک مصنوعی سرحد پار موجود پاکستان ایک ایسی محرومی کی اتھاہ دلدل میں دھنس چکا ہے کہ جو آزادی کے بعد سے نہ دیکھی نہ سنی گئی۔ معاشی انہدام، دہشت گردوں کے حملے، خودکش بمباریاں، بجلی کی اندھیر نگری، قیمتوں میں شدید اضافہ، غربت کا شکار خاندانوں کی خودکشیاں، بچوں کی اور انسانی جسمانی اعضا کی خرید و فروخت، خواتین پر تشدد اور ان کا بہیمانہ قتل؛ یہ سب لینن کے اس قول کی صداقت کا واضح اظہار ہیں کہ ''سرمایہ دارانہ نظام ایک کبھی نہ ختم ہونے والی وحشت ہے۔''

پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کے دوران اس سے وابستہ عوام الناس کی سبھی امیدیں غداری کی بھینٹ چڑھا دی گئیں۔ اب دائیں بازو کی رجعتی مسلم لیگی حکومت مزید حملوں کی تیاری کر رہی ہے۔ پاکستان ایرلائنز، پوسٹل سروسز، ریلوے، واپڈا اور دیگر اداروں کو نجکاری کی لوٹ مار کا شکار کرنے کیلئے پر تولے جا رہے ہیں۔

اس نجکاری کے نتیجے میں مزید برطرفیاں، مزید بے روزگاری، مزید غربت اور مزید معاشی بدحالی ہوگی۔ لوگوں کی سماجی اذیت پہلے ہی مذہبی جنون و بربریت، علاقائیت پر مبنی قتل عام جیسے

واقعات کے ہاتھوں انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ جبکہ بلوچستان کے اندر خونریز پراکسی جنگیں اور پشتونخواہ میں ڈرون حملوں نے الگ سے صورتحال کو لہولہو کیا ہوا ہے۔ پاکستان کی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی ریاست کے اندر ریاست کا کھلواڑ جاری رکھے ہوئے ہے۔ وہ تضادات کو ہوا دیتی اور انہیں مزید برانگیختہ کر رہی ہے۔ وہ اپنی مذموم کوششوں سے قتل وغارتگری کا بازار گرم کئے ہوئے ہے۔ عوام کی نظریں ان کے حقیقی مسائل سے اوجھل کرنے کی بدنیتی سے پاکستان کا زوال پذیر حکمران طبقہ افغانستان اور بھارت کے ساتھ تضادات کی آگ کو بھڑکانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کشمیر کا دیرینہ تنازعہ بھی دو ملکوں کے دوران ایک بگڑتا ہوا السر بن چکا ہے۔

سرمایہ دارانہ بنیادوں پر کسی مسئلے کا کوئی حل موجود ہے نہ ممکن۔ پاکستان پیپلز پارٹی ہو کہ مسلم لیگ یا پھر فوجی آمریت؛ ان میں سے کوئی بھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ صرف اور صرف ایک سوشلسٹ انقلاب ہی پاکستان، بھارت، نیپال، بنگلہ دیش اور سری لنکا کے لوگوں کو اس جہنم سے نجات دلاسکتا ہے جس میں وہ جینے پر مجبور چلے آرہے ہیں۔ زندگی گزارنے کی سبھی حالتیں دن بدن انتہائی کربناک اور خوفناک ہوتی چلی جارہی ہیں۔ وہ صورتحال پیدا ہونے کے آثار ہیں جس کے بعد 69-1968ء جیسے انقلاب کی طرز کا انقلابی ابھار پھر سے جنم لے سکتا ہے۔ تب انقلاب ایک قیادت کی کمی کی وجہ سے ناکام رہ گیا تھا۔ لیکن اب انتہائی ناقابل یقین، خوفناک اور مشکل ترین حالات میں عالمی مارکسی رجحان کی قوتوں میں بڑھوتری مستقبل کی فتح کیلئے امید اور اعتماد کا مینارہ ہے۔ اس فتح کو یقینی بنانے کیلئے لازمی ہے کہ ہم ان قوتوں میں اضافے کو دہری سرگرمی اور توانائی سے سرشار کریں۔

افغانستان

بارہ سالوں کی خونریز لڑائی کے بعد اب سامراجی اپنے بنائے ہوئے اس مقتل سے جان بچانے اور جان چھڑانے کی منتیں کر رہے ہیں۔ جب امریکیوں نے افغانستان کے اندر قدم رنجہ

فرمایا تھا، اس وقت ہم نے لکھا تھا کہ ''جس آسانی سے طالبان کا دفاعی میکنزم منہدم ہوا ہے اور جس آرام سے شمالی اتحاد والے کابل کے اندر گھسے ہیں، اس سے کئی دانا لوگوں کو یقینی گمان ہو چکا ہے کہ جنگ ختم ہو چکی؛ کہ طالبان کا خاتمہ بالخیر ہو چکا؛ صورتحال کی یہ ایک سنجیدہ غلط تفہیم کی جا رہی ہے۔''

''طالبان اقتدار سے محروم ہوئے ہیں لیکن اپنی لڑنے کی قوت سے نہیں۔ یہ پہاڑوں کے اندر گوریلا لڑائی لڑنے کے قدیمی عادی چلے آ رہے ہیں۔ یہ پہلے بھی ایسا کر چکے اور آئندہ بھی کریں گے۔ شمال میں یہ ایک الگ تھلگ اور دشمن دار علاقے میں لڑائی لڑتے آ رہے تھے۔ لیکن پشتون علاقے کے قصبے اور پہاڑ تو ان کے اپنے ہی ہیں۔ ایک تھکا دینے والی گوریلا لڑائی کے امکانات نظر آ رہے ہیں جو سالوں پر محیط ہو سکتی ہے۔ اتحادیوں کی جنگ کا پہلا مرحلہ تو نسبتاً آسانی سے طے ہو چکا ہے مگر اس جنگ کا دوسرا مرحلہ کسی طور آسان نہیں ہوگا۔ امریکی اور برطانوی فوجیوں کو تلاشی اور دشمن کو ختم کرنے کیلئے پشتون علاقوں میں جانا ہوگا اور جہاں وہ گوریلوں کیلئے ایک آسان ہدف ثابت ہوں گے۔ جانی نقصان ناگزیر ہو جائے گا۔ اور ایک وقت آئے گا کہ جب یہ صورتحال امریکہ اور برطانیہ میں رائے عامہ کو بھی متاثر کرے گی۔''

''امریکیوں کو یقین کامل تھا کہ وہ ایک فوری سرجیکل حملے کے ذریعے بن لادن کو آلیں گے اور یہ سب وہ اپنی فضائی قوت کے ذریعے کر لیں گے۔ لیکن ایسا ہونا تو کجا، یہ تنازعہ آئے روز مشکل سے مشکل ہوتا چلا جا رہا ہے اور اس جنگ کے خاتمے کے امکانی آثار محال اور غیر متعین ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ سامراجیوں کو افغانستان و پاکستان کے علاوہ ملکوں میں بھی فوج کو کام میں لانا ہوگا تا کہ مسئلے کو کسی انجام تک پہنچایا جا سکے۔''

''یہ اس سے کہیں زیادہ بدتر اور ضرر رساں حالات ہیں جو امریکہ کو نائن الیون کے وقت درپیش تھے۔ واشنگٹن کو اب پاکستان کی کھوکھلی اور غیر مستحکم حکومت سمیت دوسری علاقائی حکومتوں سے سودے بازی کرنی پڑے گی، جو اپنی ہی کارستانیوں کی بدولت غیر مستحکم ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اگر ان سب کا ہدف دہشت گردی کا خاتمہ ہے تو ان سب کو اس کے الٹ نتائج کا

سامنا کرنا پڑے گا۔ان واقعات سے پہلے یہ آسان معاملہ تھا کہ سامراجی خود کو ایک فاصلے پر رکھتے ہوئے اس خطے میں جنگ اور تباہکاری سے خود کو بچائے رکھتے لیکن اب یہ اس میں دھنس چکے ہیں ۔نائن الیون کے بعد سے امریکہ اور برطانیہ دونوں خود کو ایک مقتل میں دھکیل چکے ہیں، جس میں سے خود کو باہر نکالنا ایک بہت ہی محال اور تکلیف دہ عمل ہوگا۔''

یہ سب کچھ ہم نے 15 نومبر 2001ء کو اپنے تجزیاتی مضمون ''کابل اقتدار کا خاتمہ؛ کیا جنگ ختم ہو چکی؟'' میں لکھا تھا اور بارہ سالوں کے بعد ہم اس میں کسی بھی لفظ کا اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

2010-11ء میں فی کس 528 ڈالر سالانہ آمدنی کے ساتھ افغانستان دنیا کے 10 غریب ترین ممالک میں سے ایک ہے۔2008ء میں اس کی 36 فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے جی رہی تھی۔نصف سے زیادہ آبادی کمزوری اور نقاہت کا شکار سمجھی جاتی ہے۔ ہر ایک ہزار پیدائش میں سے 134 فوت ہو جاتے ہیں۔نوزائیدہ بچوں کی شرح اموات دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔اوسط عمر 48.1 سال ہے۔75 فیصد آبادی ناخواندہ ہے۔افغانستان دنیا میں سب سے زیادہ افیون فراہم کرنے والا ملک بھی ہے۔

ایک بے مقصد و لاحاصل جنگ پر جتنی رقم خرچ کی گئی ،اس سے سبھی لوگوں کی زندگیاں بہت بہتر کی جا سکتی تھیں لیکن اس کی بجائے سامراجی یہاں تباہی و بربادی پھیلانے کے بعد اب نکلنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔طالبان سے مذاکرات کئے جا رہے ہیں۔جن کا مستقبل کی کابل حکومت میں کافی اثر ورسوخ ہوگا۔اس ساری واردات سے کچھ بھی حاصل وصول نہیں ہوا، ماسوائے سارے خطے کو عدم استحکام میں دھکیلنے کے، جس کی ابتدا پاکستان سے ہوئی ہے۔

لاطینی امریکہ

جنوبی امریکہ کے کئی ممالک جن میں برازیل، چلی، ایکواڈور، پیرو اور کولمبیا ایک عرصے تک اپنا خام مال چین کو بھیج کر اپنی معیشتیں سنبھالے ہوئے تھے لیکن چینی معیشت کی سست روی کے اثرات کی وجہ سے ان کے اچھے دن ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ آنے والے دنوں میں اس کے سیاسی وسماجی اثرات بھی سامنے آنا شروع ہو جائیں گے۔ جیسا کہ ہم اس وقت برازیل میں کرایوں میں اضافے کے خلاف مظاہرے دیکھ چکے ہیں۔

لاطینی امریکہ میں طبقاتی کشمکش کے ابھار اور عروج کے بعد (خصوصاً وینزویلا، بولیویا اور ایکواڈور) کہ جہاں بورژوا حکومتیں اکھاڑ دی گئیں اور جہاں الیکشن میں ترقی پسند صدور کامیاب ہوئے ہیں، علاقائی سطح پر بغاوتیں ابھری ہیں۔ اس براعظم میں انقلاب کی طوفانی لہر ایک ٹھہراؤ کی کیفیت میں ہے۔ طبقات کے مابین جدوجہد ایک تعطل کی حالت میں ہے اور ابھی تک کسی ایک طبقے کو فیصلہ کن فتح نصیب نہیں ہو سکی۔

وینزویلا میں کئی قسموں کی انقلاب دشمن بغاوتیں عوام کی جانب سے ناکام بنا دی گئیں۔ اسی طرح بولیویا اور ایکواڈور میں بھی ہوا۔ سامراج اور رد انقلاب کی قوتیں یہاں کسی قسم کی کامیابی حاصل کرنے میں یکسر نامراد رہی ہیں۔ البتہ پیراگوئے اور ہونڈراس میں انہیں کامیابی ملی لیکن یہاں بھی انقلابی تحریکوں کو مکمل شکست نہیں دی جا سکی ہے۔

کولمبیا میں حکومت اور فارک (FARC) گوریلوں کے مابین مذاکرات نے یہ بات عیاں کر دی ہے کہ گوریلے کسی طور بھی جنگ جیتنے کی صلاحیت سے عاری ہیں اور یوں کولمبیا میں طبقاتی جنگ کے ابھرنے کے امکان واضح ہو رہے ہیں۔ جون سے اگست 2013ء کے دوران نئے صدر سینٹوز کی مقبولیت 46 فیصد سے گر کر 21 فیصد تک پہنچ چکی تھی۔ اس کی وجہ کافی کے کاشتکاروں، عدلیہ کے اہلکاروں، طالبعلموں کے مظاہرے اور ابھی حال ہی میں قومی سطح کی کسانوں کی ہڑتال تھی جس نے حکومت کے گلے میں رسہ ڈال دیا۔ کولمبیا کے حکمران طبقات کی سابق صدر یورائب کی طرح سے پیرا ملٹری فورسز کے ذریعے حالات کو معمول پر رکھنے کی کوشش نے عوامی مظاہروں اور ہڑتالوں کے ایک نئے سلسلے کو جنم دیا ہے۔

تاہم ایک داخلی عنصر کی غیر موجودگی کے باعث لاطینی امریکہ کے عوام اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں لینے اور سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ جس کا نتیجہ جمود اور طبقات کے مابین ایک عارضی لیکن غیر مستحکم توازن کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ کیفیت معاشی ترقی کی بدولت طوالت اختیار کیے رہی۔ 08-2007ء میں شروع ہونے والا عالمی بحران جنوبی امریکہ پر بہت کم اثر انداز ہوا تھا۔ چنانچہ یہ خطہ بہت جلد بحالی کی طرف بھی لوٹا۔ کیونکہ اس خطے کے وسائل چین میں بہت زیادہ کھپ رہے تھے۔ لیکن اب اس حالت کا خاتمہ شروع ہو چکا ہے۔ جس کا اندازہ ہمیں برازیل میں رونما ہونے والے ڈرامائی واقعات سے ہوتا ہے۔

برازیل

گزشتہ عرصے میں 2011ء تک برازیل ایک بڑی شرح ترقی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کی بڑی وجہ چین کے ساتھ اس کی برآمدات تھیں۔ اس کی بدولت سرمایہ داروں کو یہ سہولت رہی کہ وہ روزگار کی کمی اور ہڑتالوں کے جواب میں اجرتوں میں اضافے کی رعایت دے سکیں۔ 2002ء سے 2013ء کے دوران اجرتوں میں 3.5 فیصد اضافہ ہوا۔ ڈالر کی شرح تبادلہ کے حوالے سے یہ بظاہر اس سے بھی زیادہ تھا۔ اجرتوں بارے مذاکرات میں سے زیادہ تر افراطِ زر کی نسبت بڑھی ہوئی اجرتوں پر منتج ہوئے۔ یہ کامیابیاں اور صدر لولا کے دور میں کئے جانے والے ویلفیئر پروگرام ''Bolsa Familia'' جس کا مقصد سماج کے غریب ترین خاندانوں کو زندہ رہنے کیلئے سپورٹ فراہم کرنا تھا (اڑھائی کروڑ افراد اس سے مستفید ہوئے) کے باعث PT کی حکومت کو ایک بڑے عرصے تک کیلئے استحکام میسر رہا۔

لیکن اب سب کچھ تبدیل ہو چکا ہے۔ معیشت میں ایک تیز ترین گراوٹ ہوئی؛ 2011ء میں 2.7 فیصد اور 2012ء میں اس کی نمو 0.9 فیصد تک گر گئی اور اسی سے ہی سماج میں اس اضطراب کی وضاحت ہوتی ہے جس نے جون 2013ء میں ایک بڑی عوامی تحریک کی شکل میں

اپنا اظہار کیا۔ سرمایہ داروں کی طرف سے سرمایہ کاری میں نسبتاً کمی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اجرتوں میں اضافہ، پیداواری صلاحیت میں اضافے سے مطابقت نہیں رکھتا۔ 2003ء کے بعد سے برازیل کی یونٹ لیبر لاگت دوگنی ہو چکی ہے جبکہ ڈالر کی مناسبت سے یہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ ہو چکی ہے۔

سرمایہ کاری کی کم شرح، دوسری بڑی معیشتوں کے مقابلے میں، پیداواری صلاحیت میں بڑی گراوٹ کا باعث بنی ہے۔ چین کو برآمدات کے عروج نے برازیل کی تباہ کن کیفیت پر ایک عرصے تک پردہ ڈالے رکھا۔ 28 ستمبر 2013ء کی اپنی برازیل کے حوالے سے خصوصی اشاعت میں جریدہ ''اکانومسٹ'' لکھتا ہے کہ ''برازیل ایک مسلسل بڑھتے ہوئے بحرانی عہد اور طبقاتی کشمکش کی حالت کی طرف تیزی سے گامزن ہے۔ افراط زر جو کہ 6 فیصد کو پہنچا ہوا ہے، اس نے عام لوگوں کی زندگیوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا ہے اور ان کے مسائل کو بھڑکانا شروع کر دیا ہے''۔

یہ حقیقت اس کیفیت کی نشاندہی کرتی ہے کہ برازیل کی بورژوازی اب PT سے اپنا دامن چھڑانے میں لگی ہوئی ہے کیونکہ اسے نظر نہیں آ رہا کہ یہ پارٹی اب ان کیلئے ایک ایسی تیز دھار چھری ہے جس سے مزید لوگوں کے گلے کاٹے جا سکیں۔ جبکہ بورژوازی کا ایک اور دھڑا خوفزدہ ہے کہ مستقبل میں بڑھتی ہوئی طبقاتی کشمکش سے وہ اس پارٹی کی قیادت کے تعاون کے بغیر کس طرح نمٹیں گے!

کرایوں میں اضافے کے خلاف ابھرنے والی تحریک جس نے دیکھتے ہی دیکھتے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، سماج میں مجتمع ہو چکی بے چینی کا اظہار تھی۔ یہ واضح اعلان تھی کہ عرب ملکوں اور جنوبی یورپ میں اٹھنے والے انقلاب کی لہر اب برازیل پہنچ چکی ہے۔ بلاشبہ یہ تحریک قیادت سے محروم اور کئی متذبذب عناصر کا مرکب تھی، لیکن یہ ایک شاندار اور اہم تبدیلی ثابت ہوئی۔ اس کے ساتھ اور بعد ہی یہاں کئی قومی سطح کے احتجاجی دن منائے گئے جبکہ ٹریڈ یونین تحریک بھی متحرک ہوئی۔ جبکہ اساتذہ کی ایک بہت بڑی تعداد ایک ہڑتال میں عمل کے میدان میں آئی۔

براشیل کی موجودہ صدر ڈلماروزف یقینی طور پر اس استحکام سے محروم رہے گی جو کہ اس کے پیشرو صدر لولا کو میسر رہا اور اس کی حکومت کو طوالت دیئے رہا۔ یہ صورتحال برازیل کے مارکسسٹوں کیلئے غیر معمولی مواقع کی حامل ہوگی۔

وینزویلا

ہوگو شاویز کی موت کے بعد، اپریل 2013ء کے صدارتی الیکشن میں صدر ماڈورو کی کم ووٹوں سے کامیابی بولیویرین تحریک کیلئے ایک سنجیدہ انتباہ تھی۔ تاہم بورژوازی کی طرف سے ماڈورو کو ووٹوں کے ذریعے ہٹانے کی کوششوں نے بیک فائر کیا اور عوام نے بہت بڑی تعداد میں متحرک اور منظم ہو کر دائیں بازو کی ہر اشتعال انگیزی کو شکست سے دوچار کر دیا۔

اس وقت جو بنیادی اور اہم مسئلہ ہے وہ معاشی ادل بدل کا ہے جو کہ سرمایہ دارانہ معیشت کو بہتر اور باقاعدہ کرنے کی کاوشوں کے دوران ہوا اور ہو رہا ہے۔ حکمران طبقات کی طرف سے معیشت کو سبوتاژ کرنے اور کسی بھی قسم کی سرمایہ کاری نہ کرنے کی دانستہ سازشیں سماج میں موجود انقلاب کی بنیادوں کو کمزور کرتی جا رہی ہیں۔ اشیائے ضرورت کی قلت اور قیمتوں میں اضافے (50 فیصد افراط زر) کے اشتراک نے ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اس قسم کی کیفیت زیادہ طویل عرصے کیلئے قائم نہیں رکھی جا سکتی۔ یا تو انقلاب کو فیصلہ کن انداز میں سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑ پھینکنے کی طرف پیش قدمی کرنی ہوگی یا پھر یہ معاشی انتشار ایسی صورتحال پیدا کر دے گا جس کی مدد سے بورژوازی دوبارہ اقتدار پر قابض ہونے اور انقلاب کو ختم کر دینے میں کامیاب ہو جائے گی۔

اپریل 2013ء کے بعد صدر ماڈورو کی پالیسی یہ رہی کہ سیاسی میدان میں اپوزیشن کا مقابلہ کیا جائے جبکہ اسی دوران وہ کوشش کرتا رہا ہے کہ معیشت کے معاملے میں سرمایہ داروں سے معاملات طے کئے جا سکیں۔ نجی شعبے کو تجارت کے ضمن میں رعایات و مراعات دینے کا کہا گیا، ان میں ہارڈ کرنسی تک رسائی، پرائس کنٹرول کی لبرلائزیشن اور چین کی طرز پر سپیشل اکنامکس زون قائم

کرنے جیسی تجاویز شامل ہیں۔ یہ ایک یوٹوپیائی پالیسی تھی جس سے کچھ بھی حل برآمد نہیں ہونا تھا۔ سرمایہ دار طبقے کو کوئی بھی مراعت یا رعایت دینے کا ایک ہی مطلب نکلتا ہے کہ انقلاب کی سوشلسٹ بنیادوں کو پس پشت ڈال دیا جائے اور وہ بھی کسی قسم کا کوئی معاشی مسئلہ حل کئے بغیر۔

دسمبر 2013ء کے میونسپل الیکشن کے دوران حکومت نے اپنی پوزیشن بدل لی اور سرمایہ داروں کے خلاف سخت حملے شروع کر دیئے۔ یہ سب سرمایہ دارانہ نظام میں بہتری کیلئے کئے گئے لیکن ان جارحانہ اقدامات نے عوام میں مقبولیت حاصل کی اور ان کی وجہ سے عوام میں ایک بار پھر انقلابی جوش وجذبہ کوند آیا۔ سٹے بازی اور قیمتوں میں اضافوں کے خلاف اقدامات نے ہی میونسپل الیکشن میں فتح میں کلیدی کردار ادا کیا۔

اگر حکمران طبقہ دوبارہ سے اقتدار میں آنے میں کامیاب ہو بھی جاتا ہے تو بھی غالباً انقلاب کا خاتمہ نہیں ہوگا بلکہ اس کے بولیویرین تحریک پر صحتمند اثرات بھی مرتب ہوں گے۔ جیسا کہ اکتوبر 1934ء میں سپین میں شکست کے بعد ہوا تھا، جو کہ اگلی طبقاتی کشمکش کو فیصلہ کن بنانے میں اہم ثابت ہوئی تھی۔ بولیویرین تحریک میں کوئی ایک بھی ایسا رہنما نہیں جو شاویز جیسی اتھارٹی رکھتا ہو۔ اسی وجہ سے قیادت، افسر شاہی اور اصلاح پسندوں پر سوال، تنقید اور طنز کی شدت میں تیزی آتی جا رہی ہے۔

یہاں سب سے بنیادی اور مرکزی تقاضا ایک ایسی انقلابی قیادت کی تعمیر کرنا ہے جس کی جڑیں محنت کش طبقے کے ہراول دستے میں ہوں تاکہ یہ محنت کشوں کی اس شکتی کو اپنے ساتھ جوڑ سکے، اپنے اندر جذب کر سکے جس کا مظاہرہ وہ پچھلے پندرہ سالوں سے زائد عرصے سے کرتے آ رہے ہیں۔ اور جسے کام میں لاتے ہوئے اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں لیا جائے اور سرمایہ دارانہ نظام کو اکھاڑ پھینکا جائے۔

افریقہ

جنوبی افریقہ اس براعظم کا کلیدی ملک ہے۔1996ء میں پابندیوں کے خاتمے سے اب تک جنوبی افریقہ کا جی ڈی پی تین گنا ہو کر 400 ارب ڈالر ہو چکا ہے جبکہ غیر ملکی زرِ مبادلہ کے ذخائر 3 ارب ڈالر سے بڑھ کر 50 ارب ڈالر ہو چکے ہیں۔لیکن اس تمام تر ترقی کے باوجود وہاں 2013ء میں 35 فیصد افراد بیروزگار تھے جبکہ پوری آبادی کے ایک چوتھائی افراد 1.25 ڈالر روزانہ سے کم پر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔سیاہ فاموں کا اقتدار میں آنا یقیناً آگے کی جانب ایک بہت بڑا قدم تھا لیکن اس تحریک کے قائدین کی غداری کے باعث سرمایہ دارانہ نظام کے بچ جانے کی وجہ سے محنت کش طبقے کے استحصال میں اضافہ ہوا ہے۔آج جنوبی افریقہ دنیا کے سب سے زیادہ نابرابری والے ممالک میں سرفہرست ہے۔60 فیصد افراد کی سالانہ آمدن 7 ہزار ڈالر سے کم

ہے جبکہ 2.2 فیصد افراد کی سالانہ آمدن 50 ہزار ڈالر سے زائد ہے۔ 47 فیصد افراد انتہائی غربت میں رہنے پر مجبور ہیں۔ 15 سے 24 سال تک کے ایک کروڑ 40 لاکھ نوجوانوں میں سے 33 لاکھ کے پاس نہ تعلیم و تربیت ہے اور نہ روزگار۔

ایسی صورتحال میں برسر اقتدار افریقن نیشنل کانگریس عالمی مالیاتی اداروں اور سامراجی پالیسیوں پر عملدرآمد کے سوا کچھ بھی نہیں کر رہی۔ اس سال جولائی سے قبل ہونے والے انتخابات میں اس کی قیادت کو عوامی غم و غصے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو بڑھتی ہوئی غربت اور بیروزگاری سے تنگ آ چکے ہیں۔ ماریکانا کے احتجاج کرنے والے محنت کشوں کے پولیس کے ہاتھوں کئے گئے قتل عام کے زخم بھی ابھی مندمل نہیں ہوئے۔ ان شہدا کی پہلی برسی کی تقریبات میں بھی محنت کشوں کا غم و غصہ عیاں ہوا۔ ٹریڈ یونین تحریک بھی فعال اور متحرک ہے اور محنت کشوں کی ہڑتالیں اور احتجاجی مظاہرے معمول بن چکے ہیں۔ 12 سے 14 نومبر 2013ء تک ہزاروں محنت کش عوام کے مظاہرے بہت سے شہروں اور قصبوں میں دیکھنے میں آئے جس میں وہ مزدور دشمن قوانین، رد اصلاحات کے خلاف احتجاج کر رہے تھے لیکن ٹریڈ یونین قیادت میں اختلافات کے باعث یہ احتجاج روایتی طور پر جنوبی افریقہ کی معیشت پر اثر انداز نہیں ہو سکا۔ ان مظاہروں کا اعلان COSATU کی جانب سے کیا گیا تھا جس نے الیکٹرانک ٹال سسٹم، لیبر کی ٹھیکیداری اور نوجوانوں کے اجرتوں کے طریقہ کے نئے قوانین کے خلاف احتجاج کی کال دی۔

اس احتجاج سے COSATU کی قیادت میں موجود اختلافات بھی عیاں ہوئے۔ محنت کشوں کی COSATU کی قیادت میں دائیں بازو کے دھڑے کے خلاف نفرت بڑھ رہی ہے جسے وہ اپنے مسائل کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ بائیں بازو کی قیادت پر بھی نچلی صفوں سے فیصلہ کن اقدامات کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ کان کنوں کی نیشنل یونین کے صدر زوکوانا پر بھی تنقید کی جا رہی ہے۔ یہ شخص حکمران جماعت اے این سی کی نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی کا بھی ممبر ہے۔ اسی کمیٹی نے ان مزدور دشمن اقدامات کی منظوری دی تھی۔ اس کی تقریر کے دوران محنت کشوں نے احتجاج کر کے

اسے خاموش کرادیا اور اس کی منافقت اس پر ظاہر کی۔ میٹل ورکرز یونین نے اس احتجاج میں شرکت نہیں کی اور درست طور پر کہا کہ انہیں احتجاج کی تیاری کا مناسب وقت نہیں دیا گیا۔ اس کے بعد میٹل ورکرز یونین نے 17 سے 20 دسمبر کو اپنی کانگریس کا انعقاد کیا اور COSATU کے ساتھ تعلقات کا از سر نو جائزہ لیا۔ اس یونین میں 3,38,718 ممبر ہیں۔ اس کانگریس میں اے این سی کی حکومت کو تمام مسائل کا ذمہ دار قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کا تحفظ کر رہے ہیں۔ اس کانگریس میں فوری طور پر COSATU کی کانگریس بلانے کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ میٹل ورکرز کے تین لاکھ سے زائد ممبران کی اکثریت اے این سی کی بھی ممبر ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے جنوبی افریقن کمیونسٹ پارٹی کے بھی ممبر ہیں۔ COSATU میں ابھرنے والے اختلافات ایک بڑی طبقاتی کشمکش ابھرنے کے پیش خیمے کی نشاندہی کرتے ہیں جس میں مفاد پرست قیادت کے خلاف غم وغصہ ابھر رہا ہے۔ اس عرصے میں جنوبی افریقہ کی کمیونسٹ پارٹی کے نوجوان بھی متحرک ہو رہے ہیں اور نجات کے رستہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ آنے والے عرصے میں جنوبی افریقہ میں ہونے والے واقعات محنت کش طبقے کے شعور پر گہرے اثرات مرتب کریں گے۔ محنت کش طبقہ ناگزیر طور پر ایسے نتائج اخذ کرے گا جو اسے اس نظام کے خلاف جدوجہد پر آمادہ کریں گے۔ ایسی صورتحال میں انقلابی پارٹی کی قیادت محنت کش طبقے کی تحریک کو اہم کامیابیاں دلا سکتی ہے۔

نائجیریا کی معیشت کے 90 فیصد حصے کا دارومدار تیل کی برآمدات پر ہے جس میں کمی آرہی ہے۔ امریکہ نائجیریا کے تیل کا سب سے بڑا خریدار تھا جس نے اب اس تیل پر انحصار کم کر کے ملک کے اندر سے یہ ضرورت پوری کرنی شروع کر دی ہے۔ معاشی مسائل میں اضافہ غربت میں مزید اضافے کا باعث بن رہا ہے۔ انفرااسٹرکچر تیزی سے زوال پذیر ہے۔ یہ بیروزگاری کی شرح کے اعتبار سے دنیا کے سرفہرست ممالک میں شامل ہے جہاں 80 فیصد نوجوان بیروزگار ہیں۔ یہ تمام صورتحال حکمران طبقے پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے۔ حکمران جماعت پی ڈی پی میں ٹوٹ پھوٹ بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ پارٹی نہ صرف نائجیریا بلکہ پورے افریقہ کی سب سے بڑی پارٹی کہلاتی

تھی۔ پارٹی اب پرانی پی ڈی پی اور نئی پی ڈی پی کے دو دھڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ اپوزیشن کی چند بوراژوا پارٹیوں کا الائنس اے پی سی بھی حکمرانوں کی جانب سے عوام کو دھوکہ دینے کی ایک اور کوشش ہے۔ اختلافات کے باوجود ان تمام پارٹیوں کی پالیسیوں میں کوئی فرق نہیں۔ حکمران طبقے میں ٹوٹ پھوٹ کی ایک وجہ صدر گڈ لک کی حمایت میں کمی ہے جس کے باعث وہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی پالیسیوں پر پہلے کی طرح عملدرآمد نہیں کروا پا رہا۔ عوام میں صدر کی حقیقت بے نقاب ہو چکی ہے۔ اسی لئے اب صدر قومی ریاستی کانفرنس جیسے نان ایشو اچھال رہا ہے تاکہ اصل مسائل سے توجہ ہٹائی جا سکے۔

نائجیریا کی ٹریڈ یونینوں کی جانب سے بنائی جانے والی لیبر پارٹی کی قیادت بھی اصلاح پسند پالیسیوں پر گامزن ہے اور حکمران طبقے سے مصالحت کر چکی ہے۔ محنت کشوں کی اس قیادت سے وابستہ امیدیں دم توڑ رہی ہیں اور اب بہت سے بورژوا سیاستدان اس پارٹی کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ نائجیریا کے محنت کشوں اور نوجوانوں کا غم و غصہ بڑھتا جا رہا ہے اور وہ ان تمام مسائل کا حل تلاش کر رہے ہیں۔ تیل کی قیمتوں میں اضافے کے خلاف ابھرنے والی خود رو تحریک اسی بے چینی اور غصے کا اظہار تھی۔ آنے والے عرصے میں بھی ایسی تحریکیں چلنے کے امکانات موجود ہیں۔ محنت کشوں کی یکجہتی اور تحریکوں کو توڑنے کے لیے حکمران طبقات اور سامراجی قوتیں اسلامی بنیاد پرست تنظیموں کو استعمال کر رہی ہیں۔ بوکو حرم نامی بنیاد پرست تنظیم کی دہشت گرد کاروائیوں نے شمال مشرقی حصے کو یرغمال بنایا ہوا ہے جہاں گزشتہ چھ ماہ سے کرفیو لگا ہوا ہے۔ اس تمام صورتحال کا مقابلہ محنت کشوں کی طبقاتی جڑت کے ساتھ ہی کیا جا سکتا ہے جس کے لیے مارکسی نظریات سے لیس انقلابی پارٹی کی تعمیر ناگزیر ہے۔

سرمایہ داری کی بدترین شکل اس براعظم میں نظر آتی ہے جہاں معدنی وسائل کی لوٹ مار کے لیے سامراجی پشت پناہی پر خانہ جنگیاں اور جنگیں معمول ہیں۔ سامراجی طاقتوں کے ایما پر جنوبی سوڈان کے نئے ملک کے قیام کے باوجود وہاں جنگ کا خاتمہ نہیں ہو سکا۔ 1983ء سے

2005ء تک سوڈان میں چلنے والی خانہ جنگی میں 20 لاکھ افراد جنگ، قحط اور بیماریوں کی وجہ سے مارے گئے۔ اس دوران جنوبی سوڈان میں چالیس لاکھ بے گھر ہوئے جن میں سے بڑی تعداد متعدد دفعہ بے گھر ہوئی۔ اس دوران غلامی اور قتل عام کے کئی اندوہناک واقعات وقوع پذیر ہوئے۔ اسی دوران سوڈان کے مشرقی حصے میں واقعہ دارفور کے علاقے میں ہونے والی نسلی بنیادوں پر خانہ جنگی میں ہزاروں افراد قتل ہوئے۔ اس وقت جنوبی سوڈان اور سوڈان دونوں ممالک میں خانہ جنگیاں چل رہی ہیں اس کے علاوہ ان کی آپس میں جنگ کے آثار بھی نمودار ہو رہے ہیں۔ 2012ء میں بھی ان دو ممالک کے درمیان جنگ ہوئی جس کی وجہ دونوں ممالک کے مابین سرحد پر موجود تیل کے ذخائر تھے۔

اسی طرح لیبیا میں بھی قذافی کے بعد شروع ہونے والی خانہ جنگی جاری ہے جس میں ہزاروں افراد مارے جا چکے ہیں۔ مالی میں 2007ء سے شروع ہونے والی خانہ جنگی جاری ہے جس میں فرانس اور دیگر یورپی ممالک سامراجی جارحیت بھی کر رہے ہیں۔ آئیوری کوسٹ میں 2002ء سے 2011ء تک خانہ جنگی جاری رہی۔ اس کے علاوہ بھی تنازعات پورے افریقہ میں موجود ہیں جن کی بنیادی وجہ سامراجی طاقتوں کی وہاں کے وسائل پر قبضہ کرنے کی ہوس ہے۔ اس لوٹ مار کے لیے وہاں موجود نسلی، مذہبی، لسانی اور دیگر تعصّبات کو استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن ہیروں سے لے کر یورینیم تک ان تمام قیمتی معدنیات کی موجودگی کے باوجود وہاں کی آبادی کی ایک بہت بڑی اکثریت غربت اور بیماری کی گہرائیوں میں غرق ہے اور سرمایہ داری کے مظالم کا انتقام لینے کے لیے سلگ رہی ہے۔

عالمی تعلقات

لینن نے ایک بار ''عالمی سیاست میں دھماکہ خیز مواد'' کے بارے میں لکھا تھا اور آج دنیا میں ایسے مواد کی کوئی کمی نہیں۔ طیش میں کئے گئے اقدامات عالمی سامراجی طاقتوں کے لیے اندرونی اختلافات بڑھانے اور حالات کو مزید سنگین کرنے کا باعث بن سکتے ہیں۔ محض معاشی وجوہات کی بنیاد پر ہی نہیں بلکہ جنگوں اور دہشت گردی کے واقعات بھی انقلابی موڑ بننے کا موجب بن سکتے ہیں۔ ماضی میں ویت نام کے مسئلے پر بھی ہم نے یہی ہوتا دیکھا ہے اور یہ دوبارہ بھی ہوسکتا ہے۔

وکی لیکس اور سنوڈن کے منظر عام پر لائے گئے حقائق سے امریکی سامراج کی اصل دلچسپیاں، مقاصد اور خیالات سب پر عیاں ہو چکے ہیں اور منافقانہ مسکراہٹ کا جھوٹا خول اتر کر

اب ان کا حقیقی بھدا چہرہ سب کے سامنے آشکار ہو گیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ دوسری حکومتوں کے راز چھپا کر نہ رکھ سکنے کی امریکی سامراج کی نااہلی بھی سبھی پر عیاں ہو گئی ہے۔ان کے ذریعے ہی معلوم ہوا ہے کہ امریکی سامراج اپنے اتحادیوں کی بھی کتنی زیادہ جاسوسی کرتا ہے۔اور اب عوامی رائے عامہ کے آگے یہ بھی عیاں ہو گیا ہے کہ بورژوا سفارت کاری کا عمومی طور پر حقیقی کردار آخر کیا ہے!ایسا کر کے انہوں نے عالمی محنت کش طبقے کو ایک اہم سہولت میسر کی ہے۔

صرف بیس سال پہلے سوویت روس کے زوال سے عالمی تعلقات میں ایک انتہائی نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔امریکہ بہادر دنیا کی واحد اور اکلوتی سپر پاور کے طور پر سامنے آ گیا۔یہ دیو ہیکل طاقت رعونت سے بھرے ایک وحشی دیو کی طرح دنیا پر عیاں ہو کے سامنے آتی گئی۔جس کا سب سے کھلا اظہار نام نہاد ''بش ڈاکٹرائن'' میں ہوا۔امریکی سامراج نے اپنا حق سمجھ لیا کہ وہ کسی بھی ملک کے اندر گھس سکتا ہے،ان کی حکومتوں کے ساتھ اپنی مرضی کا حشر نشر کر سکتا ہے اور انہیں وہی کرنے کا کہہ سکتا ہے جو امریکہ چاہے۔لیکن بیس سالوں کی اس دیوگردی کی رعونت کے چہرے پر کافی خراشیں پڑ چکی ہیں۔

ایک معاشی اور عسکری طاقت کے طور پر چین کے ابھار نے بنیادی طور پر ایشیا اور مشرق بعید کے ممالک میں طاقت کا ایک توازن قائم کر دیا ہے۔چینی افسر شاہی کی خواہش اور کوشش ہے کہ وہ اپنی معاشی برتری کی مناسبت سے ایک سیاسی اور عسکری برتری کا مقام بھی حاصل کر لے۔ جس کے باعث خطے میں نئے تنازعات و تضادات سامنے آ رہے ہیں۔سب سے پہلے جاپان ہے جس کے ساتھ چند جزائر کا ایک تنازعہ چل رہا ہے اور جو دراصل اس طاقتوری کے کھیل کا ہی ایک اظہار ہے۔واشنگٹن اس مظہر کو ایک سنجیدہ خطرے کے انتباہ کے طور پر دیکھ رہا ہے۔مشرق بعید کا یہ خطہ ہمیشہ سے ہی امریکی سامراج کی عالمگیر حکمت عملی کا اہم حصہ چلا آ رہا ہے۔چنانچہ چین کا ایک طاقت کے طور پر ابھرنا امریکی مفادات کیلئے ایک خطرہ بن کے سامنے آیا ہے۔جو آنے والے دنوں میں سنجیدہ تنازعات کو جنم دے سکتا ہے۔

ماضی کی نسبت ،روس آجکل عالمی معاملات میں زیادہ آزادانہ کردار ادا کر رہا ہے۔اپنے حلقۂ اثر کے ممالک یوگوسلاویہ اور عراق میں ہزیمت اٹھانے کے بعد،روس اب عالمی امور

میں مزید امریکی ڈکٹیشن کا پابند نہیں رہنا چاہتا۔اس کا اظہار جارجیا میں اس وقت سامنے آیا کہ جب اسے امریکہ اپنے مدار میں لانا چاہتا تھا۔2008ء میں روس نے جارجیا میں اپنی عسکری طاقت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کو ہزیمت سے دوچار کیا اور اسے ناٹو کا حصہ بننے سے روک دیا۔اسی طرح شام کے معاملے میں بھی روس نے ریت پر ایک ایسی لکیر کھینچ دی کہ جسے امریکہ پار کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔

لیکن یہ روس کی طاقت کا اظہار نہیں ہے بلکہ اس کی بجائے یہ امریکی سامراج کی کمزوری اور مفلوج پن کی بدولت ہے۔گزشتہ دس سالوں میں امریکہ ایک ایسے بدمست ہاتھی کی طرح سرگرم چلا آرہا تھا جو شیشے کی کسی دکان میں گھسا ہوا ہوتا ہے۔جس کی بدولت اس کے اردگرد ایسا کوئی اتحادی نہیں رہا جو اس پر اعتماد کرتا ہو۔عراق پر جارحیت تو ایک تباہ کن معاملہ ثابت ہوئی۔بش کا ارادہ تھا کہ دنیا پر امریکی طاقت کی دھونس جما سکے۔لیکن بش کے اس دھونس پن نے الٹ اثرات مرتب کئے اور وہ خطہ جو پہلے ہی سے غیر مستحکم تھا اسے مزید انتشار و خلفشار میں دھکیل دیا گیا۔عراق کی فوج کو تباہ و برباد کر دیا گیا جس کے نتیجے میں عراق آگ اور خون کے سمندر میں غرق ہونا شروع ہوگیا۔خطے میں طاقت کا توازن ایران کی طرف منتقل ہوتا گیا۔

اس سارے کھلواڑ کی بدولت امریکہ میں رائے عامہ یکسر تبدیل ہو کے رہ گئی۔افغانستان اور عراق میں واضح ناکامی کے بعد امریکہ کے لوگ امریکہ کی جانب سے غیر ملکی جارحیتوں سے اکتا چکے ہیں اور امریکی تنہازدگی کا ایک احساس نیچے سے اوپر کانگریس تک سرایت ہوتا جارہا ہے۔اسی وجہ سے اوبامہ شام پر عسکری حملے کا حکم جاری کرنے میں بے بس ہوگیا تھا۔اپنی تقریر میں اپنے ہر فقرے میں اوبامہ اپنی ہی ہر ایک بات کی خود ہی تردید کرتا نظر آرہا تھا جب اس نے کہا کہ امریکہ دنیا میں وہ کچھ نہیں کرسکتا جو اسے کرنا مناسب لگتا ہے۔

مشرق وسطیٰ اس وقت عدم استحکام کی کھولتی ہوئی بھٹی بن چکا ہے۔یہ سب امریکہ کی جلد باز،تنگ نظر پالیسیوں کا شاخسانہ ہے۔علاقے میں ایران کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ نے سعودی عرب کو حواس باختہ کر دیا ہے۔سعودیوں کو اپنی اوقات کا پتہ چل گیا ہے کہ عراق کے بڑے

حصوں پر تہران کی عملداری موجود ہے۔عراق کے انتشار نے یہاں سنی اور شیعہ کے مابین ایک بہت بڑی اور مسلسل فرقہ پرستانہ خونریزی کو بھڑکایا ہوا ہے۔دہشت گردانہ بمباریاں اور قتل عام کے واقعات روزمرہ کا معمول بن چکے ہیں۔سعودی بادشاہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ طاقت تیزی سے ان کی گرفت سے نکلتی جارہی ہے۔2011ء میں بحرین میں سامنے آنے والی بڑی عوامی مزاحمت نے اس خوف کو واضح کردیا تھا۔

مشرق وسطیٰ میں ہم امریکی طاقت کی حدود و قیود دیکھ سکتے ہیں۔جن سے واضح طور پر عیاں ہوتا ہے کہ امریکی سامراج کی کمزوریوں نے کس طرح اس کے روایتی اتحادیوں کو امریکہ کی بجائے خود اپنے مفادات کو ترجیح دینے پر آمادہ کردیا ہے،جبکہ ماضی میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔کئی معاملات ایسے ہیں جن میں نہ صرف امریکہ کی مکمل حکم عدولی کی گئی بلکہ مفادات کا بھی ٹکراؤ سامنے آیا۔جیسا سعودیوں نے وعدہ کیا تھا کہ مصری فوج کی امداد میں کوئی کٹوتی نہیں کی جائے گی۔ سعودی مصر میں حسنی مبارک کے خاتمے سے بہت پریشان ہوئے تھے جو کہ ایک معتمد اتحادی تھا۔ مرسی کے اقتدار کے خاتمے کے بعد امریکہ نے مصری فوج کو دی جانے والی امداد تیزی سے کم کرنی شروع کردی۔

قطر کے حکمرانوں نے مصر میں 8 بلین ڈالر بطور امداد پھینکے اور قطر مرسی حکومت کا بنیادی سپورٹر تھا۔ان قطریوں کا خیال تھا کہ عرب ملکوں کے مطلق العنان حکمرانوں کے خاتمے سے پیدا ہونے والا خلا اسلامی بنیاد پرست پر کرلیں گے۔چنانچہ خطے میں قطر کی اثر پذیری میں اضافے کیلئے قطر نے انہیں اپنی مدد و معاونت فراہم کرنا شروع کردی۔

لیبیا میں تو قطر نے اپنی انگلیاں جلا ڈالیں پھر شام میں اور اب مصر میں بھی۔یہ ساری شاہ خرچی اپنی سیاسی ساکھ اور دھونس قائم کرنے کی غرض سے کی گئی تھی لیکن قطر غلط گھوڑے پر شرطیں لگاتا آرہا تھا۔اب متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب مصر میں مداخلت کریں گے تاکہ اس کی معیشت چلتی رہے۔یہ صورتحال ہمیں قبائل اور مافیا خاندانوں کی جنگ یاد کراتی ہے،اور اس کے سوا تیل کی دولت سے مالا مال یہ شاہی غنڈے کر بھی کیا سکتے ہیں!

شام

بعث پارٹی کی حکومت کے خلاف ایک عوامی تحریک کی ابتدا اب زوال پذیر ہو کر ایک خونریز فرقہ وارانہ خانہ جنگی بن ہو چکی ہے۔ سعودی اور قطری حکومتوں نے انقلابی عناصر کو کچلنے کیلئے صورتحال میں مداخلت کی اور یوں جدوجہد کو فرقہ وارانہ تعصب کی خونریزی میں منتقل کر دیا گیا۔

امریکہ کی کوشش تھی کہ وہ خود کو نام نہاد آزاد شامی فوج (FSA) کے اندر بورژوا ڈیموکریٹک عناصر تک محدود رکھے۔ لیکن سعودی اور قطریوں کی سازشوں نے امریکہ کو باہر دھکیل کے رکھ دیا۔ جو کہ القاعدہ کے حمایتی جہادی ملیشیاؤں کی مالی اور اسلحے کی امداد کرتے آ رہے ہیں۔ تاہم سعودی اور قطری شامی ملیشیاؤں کے مختلف دھڑوں کی مدد کر رہے ہیں۔ سعودی سلفیوں اور غیر جہادیوں پر تکیہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تا کہ جبہاۃ النصرۃ اور القاعدہ کے تسلط کے تاثر کو کم کیا جائے۔

استنبول میں قائم مغرب کی حمایت یافتہ ''نیشنل کولیشن'' کا قیام نومبر 2012ء میں لایا گیا تھا اور ایک سو سے زائد ملکوں کی جانب سے اسے شامی اپوزیشن کی نمائندہ قانونی حکومت بھی تسلیم کیا جا چکا ہے۔ امریکہ اور یورپی یونین بھرپور کوشش کریں گے کہ خود کو اپوزیشن میں موجود اعتدال پسند بورژوا عناصر کے ساتھ منسلک رکھیں۔ لیکن اس حوالے سے انہیں ایک ناقابل عبور مرحلے کا سامنا کرنا پڑ گیا جب نیشنل کولیشن کو گیارہ اسلامی ملیشیاؤں نے کھلے عام مسترد کر دیا۔ ان میں سے کچھ وہ بھی ہیں جو کہ آزاد شامی فوج کا بھی حصہ ہیں۔ ان سب نے قرار دیا کہ وہ اسے تسلیم نہیں کرتے۔

یہ بات سب پر واضح ہے کہ یہ جہادی ہی ہیں جو کہ زیادہ تر لڑائی میں شریک ہیں اور یہ کسی طور بھی خود کو نیشنل کولیشن کے تابع نہیں کرنا چاہتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اپوزیشن کے مختلف دھڑے آپس میں لڑتے آ رہے ہیں۔ جس کی بدولت اپوزیشن میں انتشار بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ مرکزی قوت کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، شمال مشرق میں کردوں نے خود کو عملی طور پر

آزاد کرلیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت خطے میں کردوں کی اپنے تئیں کم وبیش دو ریاستیں قائم ہو چکی ہیں۔اس کی بدولت عدم استحکام مزید شدید ہو چکا ہے اور یہ ترکی اور ایران دونوں ملکوں میں کرد علیحدگی پسندوں کو تقویت بخشے گا۔

رجعتی اسلامی بنیاد پرست عناصر اب مسلح بغاوت پر مکمل قابو پا چکے ہیں۔جہادیوں اور آزاد شامی فوج کے مابین کھلی لڑائی شروع ہو چکی ہے۔اب ملیشیاؤں میں وہ بھی شامل ہو چکے ہیں جو حکومت کی حمایت میں لڑ رہے ہیں لیکن جو بشار کے کنٹرول سے باہر ہیں۔شام بھی اب اس بدقسمتی کی جانب رواں دواں ہے جس پر افغانستان اور عراق ہو چکے ہیں،اور جہاں مقامی جنگجو سردار اپنی اپنی راجدھانی قائم کر کے سرگرم ہیں۔یہ ملک ہماری آنکھوں کے سامنے ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔ شام میں اس وقت جو ہو رہا ہے وہ دونوں طرف ایک ردانقلاب کے سوا کچھ نہیں۔

دونوں فریق ایک دوسرے کا خون بہاتے اب تک لڑتے آ رہے تھے لیکن پھر حزب اللہ اور ایران کی مداخلت نے طاقت کا توازن بدلنا شروع کر دیا جو کہ 2013ء سرما کے بعد سے حکومت کے حق میں جا رہا ہے۔امریکی ایک بہانہ ڈھونڈ رہے تھے جس کی مدد سے انہیں شام میں مداخلت کا موقع مل سکے تا کہ صورتحال کو اپنی مٹھی میں لے سکیں لیکن امریکی سامراج کی بے بسی اس وقت کھل کر سامنے آ گئی جب اوبامہ کو شام پر حملے کی حمایت کیلئے ووٹ نہیں مل سکا۔جس کے بعد اسے روس نے کلی طور پر منظر سے باہر کر دیا اور اس نے سفارتکاری کو اس وقت ٹھپ دیا جب جان کیری کو عجلت میں یہ غیر تیار شدہ بیان دینا پڑا کہ اگر شام اپنے کیمیائی ہتھیار ترک کرنے پر راضی ہو جائے تو اس پر حملہ کرنے سے باز رہا جا سکتا ہے۔

کیمیائی ہتھیاروں کا مسئلہ سامراج کے پاگل پن اور منافقت کو واضح عیاں کرتا ہے۔آیئے کچھ دیر کیلئے ہم اس حقیقت کو بھی بھول جاتے ہیں کہ امریکہ میں اس وقت دنیا کا سب سے بڑا کیمیائی ہتھیاروں کا ذخیرہ موجود ہے۔اور ہم یہ بھی فراموش کر دیتے ہیں کہ امریکہ نے ہی ویتنام میں ایجنٹ اورنج سمیت کئی کیمیائی عناصر کا وحشیانہ استعمال کیا تھا اور شاید نیپام بم بھی۔حالیہ عرصے میں فلوجہ میں فاسفورس بموں کا بھی استعمال ہمیں بھولنا ہوگا کہ جس کی وجہ سے ایک بڑی

آبادی بہت بڑی بربادی کی بھینٹ چڑھادی گئی۔اور ہاں جب صدام ایرانی فوج کے خلاف کیمیائی ہتھیاروں کے ساتھ جنگ کررہا تھا تب بھی امریکیوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔

یہ بات اب کھل کر واضح ہوچکی ہے کہ شام پر حملے کیلئے کیمیائی ہتھیاروں کا بہانہ جان بوجھ کر تراشا جارہا تھا کیونکہ ایران اور حزب اللہ کے بل بوتے پر حکومتی فورسز باغیوں کو شکست دینے میں کامیاب ہوتی جارہی تھیں۔واشنگٹن کا ارادہ تھا کہ وہ شامی حکومتی فورسز پر حملے کرکے باغیوں کی امداد کرے گا۔لیکن اس کا یہ بھی منشا نہیں تھا کہ باغیوں کو عسکری کامیابی ہونے دی جاتی بلکہ مقصود یہ تھا کہ ایک ایسی متوازن کیفیت پیدا کردی جائے جس کی بدولت امریکہ سفارتکاری کا چکر چلا کے اپنی دھاک بٹھا سکے۔شام کے بدقسمت لوگوں کے مفادات یا انسانی ہمدردی کا اس سارے معاملے میں کہیں کوئی عمل دخل نہیں تھا۔

اس سازش کو شام کی حکومت نے (روس کی شہہ پر) اس وقت کاٹ دیا جب اس نے یہ پیشکش کردی کہ وہ اپنے سب کیمیائی ہتھیاروں سے دستبردار ہونے کیلئے تیار ہے۔اس عملی اقدام سے شام کی فوجی صلاحیت پر کوئی فرق نہیں پڑنا تھا کیونکہ اس نے لڑائی کے دوران روایتی ہتھیاروں سے اپنے دشمن کو خوب زک پہنچائی تھی۔کیمیائی ہتھیاروں کے معاملے میں امریکہ کو پسپا کرنے کے بعد بشار حکومت نے باغیوں پر اپنے حملوں کو اور تیز کردیا اور انہیں بھاری نقصان سے دوچار کرنا شروع کردیا لیکن ابھی تک یہ واضح نہیں ہے کہ یہ جنگ کون فریق جیتا اور کون فریق ہارا ہے۔

امریکہ اور روس چند دیگر علاقائی قوتوں کے ساتھ مل کر جنیوا میں ایک ''امن کانفرنس'' منعقد کرانے کیلئے جوڑتوڑ میں مصروف ہیں۔لیکن اگر یہ کانفرنس ہو بھی جاتی ہے تب بھی اس کے نتائج شام کے عوام کے کسی کام نہیں آئیں گے۔ایک طرف قطری اور سعودی رجعت کی تاریک قوتوں کی سرپرستی کررہے ہیں جبکہ امریکہ کا واحد مقصد خطے میں اپنا اثر ورسوخ قائم رکھنا اور ایران کے بڑھتے اثر ورسوخ کو روکنا ہے۔اسی طرح روس کا ہدف بھی شام پر اپنی بالادستی برقرار رکھنا ہے کہ وہ اس کے ایک روایتی حلیف کے منصب پر فائز رہے۔ابھی تک روسی بشار کی حمایت کرتے چلے آرہے ہیں لیکن وہ شام میں اپنے مفادات کیلئے اسے داؤ پر لگادینے میں ذرا سا بھی تامل نہیں کریں گے۔روسی

اور امریکی دونوں ہی، اپنے یورپی بھائیوں کی طرح، اس بات پر متفق ہیں کہ شام کو بہر حال ''نظم و نسق'' کے مقدم اصول کے تحت چلایا جانا چاہئے۔

ایک عسکری تعطل کی بدولت غیر ملکی قوتوں کو یہ موقع مل گیا ہے کہ وہ ایک ''مذاکراتی معاہدے'' کیلئے پھرتیاں دکھا سکیں۔ تہران اور واشنگٹن کے مابین عارضی خیر سگالی سے ممکن ہے کہ ایران کو بھی جنیوا کانفرنس میں شریک کرلیا جائے۔ اس تصور کا تہران اور دمشق دونوں جگہ جشن منا کر خیر مقدم کیا گیا ہے جبکہ اسرائیل اور سعودی عرب اس تجویز سے سخت برانگیختہ ہو رہے ہیں۔

شام کے عام لوگ اس سارے کھیل اور کھلواڑ بارے کیا سوچتے ہیں، اس کا کسی کو کوئی اندازہ ہے نہ خبر۔ نہ ہی یہ جنیوا کانفرنس میں موجود ہوں گے اور نہ ہی اس سارے عمل میں بھاگ دوڑ کرتی قوتوں کو ان عام لوگوں کی خواہشوں اور سوچوں سے کوئی سروکار ہے۔ شام کے عام لوگوں کیلئے واحد امید کسی بھی اہم ملک کے اندر ایک سوشلسٹ انقلاب کی فتحیابی ہے۔ جو ڈرامائی طور پر طبقات کے مابین توازن کو تبدیل کردے گی۔ شام کا مستقبل اب شام کی سرحدوں سے کہیں باہر وابستہ ہو چکا ہے؛ یعنی ترکی، ایران اور سب سے بڑھ کر مصر میں رونما ہونے والی انقلابی پیش قدمی سے۔

مصر کا انقلاب

ابھی تک ختم نہ ہو سکنے والے شاندار عرب انقلاب نے، بورژوازی کے مطابق ''عرب کی گلیوں میں'' لاکھوں لوگوں کی طاقت کی وسعت کو واضح کر دیا ہے۔ یہ عالمی تاریخ کا رخ موڑ کر رکھ دینے والا واقعہ تھا۔ معاشی اور سیاسی دونوں حوالوں سے مشرق وسطیٰ کے واقعات بہت گہرے اثرات مرتب کریں گے۔ مصر عرب دنیا کا ایک اہم ترین ملک ہے۔ یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے، عرب دنیا اور پورے خطے میں ہمیشہ اس کے بہت گہرے اثرات پڑتے ہیں۔ انقلاب ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے جس میں عوامی ابھار نے مرسی اور اخوان کا تختہ اکھاڑ دیا ہے۔

مرسی کا تختہ اکھاڑنے والی عوامی انقلابی تحریک، ایک کروڑ ستر لاکھ لوگوں کو مصر کی سڑکوں پر

لے آئی تھی۔اس حجم کی تحریک کا تاریخ میں اور کوئی ثانی موجود نہیں۔درحقیقت جون 2013ء میں طاقت عوام کے ہاتھوں میں ہی تھی،لیکن انہیں اس بات کا احساس نہیں تھا اور انہیں یہ بات سمجھانے والا کوئی موجود بھی نہیں تھا۔بنیادی مسئلے کو آسانی سے بیان کیا جا سکتا ہے؛ لوگ اتنی طاقت رکھتے تھے کہ حکومت کا تختہ الٹ دیتے،لیکن وہ ضرورت کے مطابق منظم اور اتنے باشعور نہیں تھے کہ اس طاقت پر قبضہ بھی کر لیں جو کہ ان اپنے ہی ہاتھوں میں آ چکی تھی۔بدقسمتی سے موقع ضائع ہو گیا اور آرمی چیف کو خلا پُر کرنے کا موقع مل گیا۔

آرمی کے اقدامات 5 اکتوبر 1795ء کے نپولین کے اقدامات سے مشابہہ تھے،جب نپولین نے شاہ کے وفاداروں کے ایک ہجوم کو ایک وحشیانہ کاروائی کے ذریعے منتشر کر دیا تھا۔اب کی طرح تب رجعتیوں نے ایک تحریک شروع کر دی تھی،جو اگر کامیاب ہو جاتی تو یہ ردانقلاب کی ایک بہت بڑی فتح ہوتی۔مصر میں عوام نے ایک بہت بڑی تعداد میں اخوان کے خلاف کاروائیوں کی حمایت میں جوش وجذبے کا اظہار کیا جسے وہ بجا طور پر ایک تاریک رجعتی قوت سمجھتے ہیں،لیکن اس تاریخی مشابہت کی اپنی حدود وقیود بھی ہیں۔نپولین اپنی ردانقلابی آمریت اس لئے مسلط کرنے میں کامیاب ہوا تھا کہ انقلابی عوام منتشر ہو کر بکھر چکے تھے۔جبکہ مصر میں اس کے برعکس انقلابی شکتی ابھی زائل نہیں ہوئی اور یہ اپنا وقتاً فوقتاً اظہار بھی کرتی آ رہی ہے۔

انقلاب کی طاقت،اخوان کی مرسی کے حق میں لوگوں کو جمع نہ کر سکنے کی بے بسی اور کمزوری کی صورت میں نظر آ رہی تھی۔جو محض قاہرہ اور سکندریہ شہر میں ہی قابل ذکر مظاہرے کرنے میں کامیاب ہو سکے اور وہاں بھی محض زیادہ امیر اور مڈل کلاس کے حصے ہی شامل ہوئے۔باقی ہر طرف انہیں انقلابی عوام کی جانب سے بے رحمانہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جو انہیں ایک کے بعد دوسری جگہ سے نکال باہر کر رہے تھے۔حتمی طور پر وہ آسانی سے بکھر گئے اور فوج نے انہیں کچل ڈالا۔

ایک حقیقی انقلابی مارکسسٹ پارٹی کی غیر موجودگی میں فوجی چیف آسانی سے بونا پارٹسٹ طرز کی سازش میں کامیاب ہو گئے۔پہلے عوام کو اخوان کے خلاف ابھرنے دیا گیا اور پھر اگلے دن مزدوروں کے رہنماؤں کو گرفتار کر کے ہڑتالوں کو ختم کر دیا گیا۔

انقلاب عوام کے لیے ایک وسیع سکول ہے جس میں وہ تجربات سے سیکھتے ہیں۔دوسرا انقلاب پہلے انقلاب سے کہیں آگے کے پیمانے کا تھا۔''ہم سب مصری ہیں'' کے نعروں میں موجود نرمی اب ختم ہو چکی تھی،اس کی بجائے اب انتہائی سخت اور غیر متزلزل انقلابی عزم موجود تھا جس کا مطلب تھا کہ اس مرتبہ 2011ء میں لیے گئے وقت کے محض ایک ٹکڑے یعنی اٹھارہ دنوں میں ہی سارا عمل مکمل ہو گیا تھا۔لیکن SCAF کے ہاتھوں میں طاقت دینے کا مطلب تھا کہ طاقت پھر سے پرانے حکمران طبقے کے،مرسی کے علاوہ ایک دوسرے دھڑے کے، ہاتھوں میں دی جا رہی ہے۔اس کا مطلب ہے کہ عوام کو ایک اور تلخ تجربے سے گزرنا ہوگا۔

یہ سچ ہے کہ السیسی ایک ردانقلابی ہے جیسا کہ روس میں فروری انقلاب کے بعد بونا پارٹسٹ کرنسکی آ گیا تھا۔لیکن یہ مرسی سے کہیں زیادہ چالاک ہے۔مرسی کا ردِانقلابی کردار واضح تھا لیکن السیسی کا کردار عوام کی نظروں میں ابھی تک واضح نہیں ہے اور وہ اسے اپنا ساتھی سمجھ رہے ہیں۔وہ اخوان کے خلاف کئے گئے کریک ڈاؤن کو انقلابی عمل سمجھ رہے ہیں۔اسی لئے وہ سیسی کو وقت دینے کے لیے تیار ہیں لیکن عوام کا صبر ہمیشہ کے لئے رہنے والا نہیں ہے۔پہلے ہی السیسی کی بنائی گئی ہبلاوی حکومت کافی غیر مقبول ہے۔

پارلیمانی اور صدارتی انتخابات کے بعد حکومت کے خلاف تنقید بڑھے گی اور انقلاب اور نئے حکمرانوں کے مابین تضادات کھل کر واضح ہوتے جائیں گے۔بنیادی مسئلہ معاشی بحران ہے جس نے بڑے پیمانے پر بے روزگاری اور غربت کو پیدا کیا ہے۔قیمتوں اور روزگار کا سوال حل نہیں کیا جائے گا۔اگر السیسی اگلے الیکشن میں کھڑا ہوتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ وہ بھاری اکثریت سے جیت جائے۔لیکن ایک بار طاقت میں آنے کے بعد لوگ اس سے توقعات وابستہ کرلیں گے کہ وہ محنت کشوں، کسانوں اور بیروزگاروں کیلئے کچھ کرے۔روزگار، روٹی اور گھر فراہم کرے لیکن سرمایہ دارانہ بنیادوں پر ایسا ممکن نہیں۔تب ایک نئے طوفانی عہد کا ابھار ہوگا۔

مصر میں آئے دن نئے نئے تازہ دم عناصر جدوجہد میں شریک ہوتے جا رہے ہیں۔پرانے

تھکے ہوئے ، یہاں تک کہ وہ جنہوں نے ابتدائی مراحل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، شاید الگ تھلگ ہو جائیں گے، کیونکہ وہ مایوس اور بیزار ہو چکے ہوں گے وہ بھی ایسے واقعات کی بدولت کہ جن کا انہیں اندازہ نہیں تھا اور جن کی وہ پیش بینی بھی نہیں کر سکتے تھے۔اس ناسمجھی کی وجہ سے وہ مسلسل شکایت کنندگی کی ایک کیفیت کا شکار ہو جاتے ہیں کہ عوام کچھ کرتی ہی نہیں۔لیکن یہی وہ لوگ ہیں جو ایک مہلک جرم کا ارتکاب کرتے ہیں جس کی بدولت یہ انقلاب کو رد انقلاب کے ساتھ گڈمڈ کر دیتے ہیں۔

اس قسم کے بھولے بسرے ''لیفٹسٹ'' احباب سامراجیوں اور بورژوازی کے اس پروپیگنڈے کی نقالی کرتے ہیں کہ یہ انقلاب نہیں ایک عوامی بغاوت تھی، انہیں نہ پہلے کبھی واقعات کی سمجھ آئی نہ آئندہ ہوگی۔گزشتہ سال جون کی تحریک درحقیقت ایک دوسرا مصری انقلاب تھی اور مصر کے عوام نے رجعتی اخوان کی حکومت کا تخت اکھاڑ کر اپنی طاقت اور توانائی کا احساس و اظہار کر دکھایا جو ختم نہیں ہوئی تھی۔اور جو آگے چل کر نئے انقلابی حالات کو جنم دینے میں مددگار ثابت ہوگی۔ہمیں پرانے تھکے ہارے عناصر سے پیٹھ موڑنی اور نئے تر و تازہ عناصر کی طرف دھیان دینا ہوگا۔نئی نسل کے لڑاکا جذبوں کا ساتھ دینا ہوگا۔یہی مستقبل کے انقلاب کے معمار ہیں۔

ایران

الیکشن میں روحانی کی فتح صورتحال میں ایک نئی کروٹ کا پیش خیمہ ہے۔یہ الیکشن ایک واضح اعلان تھے کہ ایرانی حکومت اب پچھلے طور طریقوں سے کام نہیں چلا سکتی۔ 2009ء کی شاندار تحریک کو سختی سے کچل دیا گیا تھا۔اسے ایک مسلسل اندرونی دباؤ اور پھر جمہوری حقوق منسوخ کر کے پچھاڑ دیا گیا۔ایرانی بحران اپنا اظہار احمدی نژاد اور خامنائی کے مابین شدید اختلاف کی شکل میں کر رہا تھا اور معیشت ایک گراوٹ کی زد میں تھی۔جس کی بڑی وجہ امریکہ اور یورپ کی طرف سے

عائد کردہ پابندیاں تھیں۔ بیروزگاری جو پہلے بھی شدید تھی، ان کے باعث ریکارڈ شرح تک پہنچ چکی تھی۔ ریال کے انہدام نے عیاں کر دیا کہ افراط زر 100 فیصد سے بڑھ چکا تھا۔ صنعت ، پیداوار اور تجارت جامد ہو چکے تھے۔

لاکھوں ورکروں کو انتہائی افراط زر کا سامنا تھا اور وہ بھی اس حالت میں کہ یا تو ان کا روزگار چھینا جا چکا تھا یا کئی کئی مہینوں سے انہیں اجرت نہیں مل رہی تھی۔ مڈل کلاس کیلئے تو یہ سب ایک مکمل تباہی تھا۔ عام حالات میں خوشحال اور خوشگوار زندگی جینے والے راتوں رات کنگال اور بدحال ہو گئے۔ ان کی بچتیں قدر سے محروم ہو چکی تھیں اور ان کے کاروبار تباہ ہو گئے تھے۔

صدارتی الیکشن اپنے تئیں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ قرار دیئے جا رہے تھے۔ لیکن مہم کے دوران کئی امیدوار ایک دوسرے پر چڑھ دوڑے اور مغلظات سناتے رہے۔ حکمران طبقات کی آپسی پھوٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عوام نے خود کو منظر نامے میں شریک کرنے کی ٹھان لی۔

روحانی کے جلسے عوام کی توجہ کا مرکز بنتے چلے گئے۔ الیکشن میں عوام کی بھرپور مداخلت نے حکمرانوں کے سبھی منصوبوں اور امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ملاؤں کو اپنا طرز و اسلوب بدلنا پڑ گیا۔ روحانی ان میں سے ہے جو اصلاحات کر کے نیچے سے انقلاب کو روکنا چاہتے ہیں۔ اس کیلئے حکومت کو کچھ ایسے اقدامات کرنے پڑے ہیں جن کی بدولت نیچے دباؤ میں کمی لائی جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ روحانی کے حوالے سے اس قدر خوش گمانیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ لیکن جمہوری دباؤ کم کرنے کے بعد معاشی دباؤ سطح پر آ جائے گا۔

حکومت امریکہ کے ساتھ معاہدے کی کوشش کر رہی ہے تا کہ منڈی کو اس کیلئے کھولا جا سکے۔ اس کے ساتھ ہی حکومت کچھ رعایتیں بھی لینا چاہتی ہے۔ خاص طور پر تیل کے کمزور انفراسٹرکچر میں سرمایہ کاری کے حوالے سے۔ اس قسم کا کوئی معاہدہ، اگر یہ ممکن ہوتا ہے، نیچے عوام کا ایک بھی مسئلہ حل نہیں کر سکے گا۔ ایرانی بورژوازی کیلئے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اپنے عوام کے استحصال کو شدید کرتی جائے لیکن یہ بھی آگ پر تیل چھڑکنے کے مترادف ہوگا۔ سماجی گھٹن میں نرمی

کا ہر قدم محنت کشوں اور نوجوانوں کو اپنے اندر منظم کرنے کا موقع فراہم کرے گا جو مستقبل میں بڑے طوفانی واقعات کو جنم دے گا۔

یہ نرمی اپوزیشن اور بائیں بازو کے رجحانات کو نئے مواقع فراہم کرے گی۔ اپوزیشن اور حتیٰ کہ بائیں بازو کہ کچھ اخبارات ابھی سے منظر عام پر آنا شروع ہو گئے ہیں۔ اپوزیشن کی قوتیں بتدریج ابھر رہی ہیں۔ نوجوان سوشلزم اور انقلابی نظریات کی طرف راغب ہو رہے ہیں۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ روحانی سے متعلق ابہام موجود ہیں مگر یہ خوش فہمیاں حالات کا مقابلہ زیادہ دیر نہیں کر سکیں گی۔ عوام کو ضروری نتائج حاصل کرنے لئے بورژوا جمہوریت کے تجربے سے گزرنا پڑے گا۔

نابرابری اور سرمائے کا ارتکاز

مارکس نے پیش گوئی کی تھی کہ سرمایہ داری کی ترقی ناگزیر طور پر زیادہ سے زیادہ دولت کو کم سے کم ہاتھوں میں مرتکز کرتی جائے گی، واقعات نے مارکس کے اس مؤقف کو بالکل درست ثابت کیا ہے۔ مارکس نے سرمایہ کی جلد اول میں قرار دیا تھا کہ ''ایک سمت چند ہاتھوں میں سرمائے کا ارتکاز ہوتا جاتا ہے، تو دوسری طرف محرومی کا بھی شدید ارتکاز ہوتا جاتا ہے۔'' یہی وہ حالت ہے

جس میں ہم سب اس وقت موجود ہیں۔ ہر طرف ہر جگہ ایک خوفناک نابرابری پھن پھیلائے ہوئے موجود ہے۔

اس میں جتنا سرمایہ شامل ہے اس کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ 1993ء سے 2011ء کے دوران امریکہ میں اوسط آمدن مجموعی طور پر 13.1 فیصد بڑھی۔ لیکن غریب ترین 99 فیصد کی اوسط آمدنی (ان میں ہر وہ خاندان شمار ہوتا ہے جس کی سالانہ آمدنی 370,000 ڈالرز تک ہے) میں صرف 5.8 فیصد اضافہ ہوا۔ اس امتیاز سے پتہ چلتا ہے کہ اوپر کا ایک فیصد کس قدر کما رہا ہے۔ بحران سے قبل امریکہ کی قومی آمدنی میں محنت کا حصہ 62 فیصد تھا جو اب GDP کے 59 فیصد تک آچکا ہے۔ نابرابری کے بڑھنے سے اوسط گھریلو آمدنی میں بحران کے بعد سے کمی آرہی ہے۔

یہ ایک حیران کن تضاد ہے کہ بحران کے بعد سے امریکی سٹاک ایکسچینج میں 50 فیصد کا اضافہ ہوا ہے جبکہ اوسط آمدنیاں انحطاط کا شکار ہیں۔ بے تحاشا دولت سیاسی طاقت میں ڈھلنا شروع ہوجاتی ہے۔ یہ دولتمند اخبارات، ٹیلی ویژن چینلز خریدنا شروع کردیتے ہیں اور سیاسی مہموں، پارٹیوں اور لابیوں کو فنڈ دینے لگ جاتے ہیں۔ امریکہ میں ایک صدر کیلئے لازمی ہے کہ وہ کروڑ پتی بھی ہو اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اسے ارب پتیوں کا تعاون اور آشیر باد بھی میسر ہو۔ کوئی بھی زیادہ بولی دینے والا جمہوریت کو خرید اور پھر بیچ سکتا ہے۔

سماجی و معاشی ترقی کا افسانہ اب ایک سفید جھوٹ بن چکا ہے۔ امیر والدین کے بچے بھی امیر ہوتے ہیں۔ حکمران طبقہ ایک ایسی خودزدہ اشرافیائی پرت ہوتی ہے جو باقی سماج سے کٹ چکی ہوتی ہے۔ حالت یہاں تک جا پہنچی ہے کہ یونیورسٹیوں کی تعلیم کے دروازے طلباء کی بہت بڑی تعداد کیلئے بند ہوتے جارہے ہیں۔ اور جن محدود سے خوش نصیبوں کو موقع مل بھی جائے تو ان کو تعلیم کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ان کیلئے ان کی مطلوبہ نوکری ہی دستیاب نہیں ہے۔ بلندی کو لے جانے والے غبارے کی ہوا ہی نکال دی گئی ہے۔ یونیورسٹی گریجوایٹس اب میکڈونلڈز کے برگر بیچنے یا پھر سپر مارکیٹوں کی شیلفیں صاف کرنے پر مجبور کردیے گئے ہیں۔

''امریکن ڈریم'' اب ایک ڈراؤنا خواب بن چکا ہے۔ 47 ملین امریکی شہری مجبور ہیں کہ

وہ فوڈ سٹیمپ سکیم سے مہینے کے آخر میں مستفید ہوا کریں۔اس سماجی اذیت اور ذلت کا سیاسی اظہار ''آکوپائی وال سٹریٹ موومنٹ'' کے نعرے ''ہم 99 فیصد ہیں'' میں سامنے آیا تھا۔ صورتحال میں پنہاں خطرات سے سرمائے کے سنجیدہ ماہرین بخوبی آگاہ ہیں۔

طبقات کے مابین خلیج

عام انسان اس شرط پر قربانیاں دینے پر تیار ہیں کہ کرے کوئی بھرے کوئی۔ چونکہ مقصد نیک ہے چنانچہ سب اس کیلئے قربانی دیں۔لیکن کوئی بھی بینکاروں کو بچانے کیلئے قربانیاں دینے کیلئے تیار نہیں ہے۔قربانی کیلئے تو برابری کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ بینکار ٹیکس دینے والوں کی آمدنیوں سے اپنی جیبیں بھرتے جا رہے ہیں اور یہ کارِ خیر حکومتیں کر رہی ہیں۔کسی نے بھی اس بارے ٹیکس دینے والوں کی رائے جاننے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ان آمدنیوں پر یہ بینکار خود کو بھاری بونسوں سے بھی نوازتے چلے جا رہے ہیں۔

بحران کے عین بیچ میں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا چلا گیا۔ Credit Suisse نے ایک چارٹ شائع کیا ہے جس میں کروڑ پتیوں (ڈالروں میں) کی وسط 2012ء سے وسط 2013ء کے دوران تعداد میں اضافے کا بتایا ہے۔

سپین: 402,000 (13.2 فیصد اضافہ)
امریکہ: 13,210,000 (14.6 فیصد اضافہ)
فرانس: 2,210,000 (14.9 فیصد اضافہ)
جرمنی: 1,730,000 (14.6 فیصد اضافہ)
برطانیہ: 1,520,000 (8.2 فیصد اضافہ)

اٹلی:1,440,000(9.5فیصداضافہ)

چین:1,120,000(8.7فیصداضافہ)

کینیڈا:993,000(4.7فیصداضافہ)

اسی ادارے کی ایک اور رپورٹ میں دولت کی غیر مساوی تقسیم بارے دلچسپ اعداد وشمار شائع کئے ہیں جس کے مطابق ٹاپ پر موجود 32 ملین افراد 98.7 ٹریلین ڈالرز کو کنٹرول کرتے ہیں۔اس کا مطلب ہے کہ دنیا کی 41 فیصد دولت دنیا کے صرف 0.7 فیصد بالغ افراد کے ہاتھوں میں ہے۔وہ جن کی ذاتی دولت ایک لاکھ سے دس لاکھ ڈالروں کے درمیان ہے،سب سے نیچے شمار ہوتے ہیں۔آبادی کا 7.7 فیصد یہ حصہ 101.8 ٹریلین ڈالروں کا مالک ہے اور یہ کل دولت کا 42.3 بنتا ہے۔

جبکہ اس کی دوسری انتہا کچھ یوں ہے کہ 3.2 ارب آبادی کے پاس کل ملا کے 7.3 ٹریلین ڈالرز موجود ہیں یعنی دنیا کی بالغ آبادی کا 68.7 حصہ دنیا کی دولت کا صرف 3 فیصد کا مالک ہے۔اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ دنیا کی بالغ آبادی کے 7 . 0 فیصد کی کل دولت ،دنیا کی 68.7 فیصد بالغ آبادی کی کل دولت سے 14 گنا زیادہ ہے۔

یہ اعداد وشمار مارکس کی سرمائے کے ارتکاز بارے پیش گوئی کی تصدیق کرتے ہیں۔

''ایک سرے پر دولت مرتکز ہوتی ہے،جبکہ اسی دوران ہی دوسرے سرے پر محرومی،مکروہ قسم کی غلامی،جہالت،وحشت،ذہنی پسماندگی کا اجتماع ہوتا چلا جاتا ہے۔اور یہ اس طبقے کے ساتھ ہوتا ہے جو کہ سرمائے کی شکل میں اپنی اشیاء خود پیدا کر رہا ہوتا ہے۔''(مارکس؛جلد اول؛باب 25)

مجتمع شدہ معیشت

لینن نے وضاحت کی تھی کہ سیاست مجتمع شدہ معیشت ہوتی ہے۔کم از کم ترقی یافتہ ممالک میں تو ایک لمبے عرصے تک سرمایہ دارانہ نظام بظاہر''چیزیں مہیا کرنے والا'' بنا رہا۔امریکہ اور

یورپ میں دوسری عالمی جنگ کے بعد کی دہائیوں میں جوان ہونے والی نسلیں بے مثال معاشی ابھار کی بنیاد پر حاصل ہونے والے مکمل روزگار، بڑھتے ہوئے معیار زندگی اور اصلاحات جیسے فائدوں سے محظوظ ہوتی رہیں۔

یورپ میں یہ اصلاح پسندی کا کلاسیکل عہد تھا۔ پھیلتی ہوئی معیشت اور بڑے منافعوں کی بنیاد پر سرمایہ دار طبقہ کے پاس اصلاحات کی اجازت دینے کی گنجائش موجود تھی۔ لیکن اب ایسی صورتحال نہیں ہے۔ بیروزگاروں کو مالکوں کی طرف سے آفر کی گئی کسی بھی تنخواہ پر کام کرنے پر مجبور کرتے ہوئے سرے سے فلاحی ریاست کا خاتمہ کرنا ہی اب بورژوازی کا اصل منصوبہ ہے۔ کہنے کا مطلب کارل مارکس اور چارلس ڈکنز کے وقتوں کی طرف واپس جانا ہے۔ صرف مزدوروں کی منظم طاقت کے ذریعے ہی اس سماجی ردانقلاب کو روکا جاسکتا ہے۔

کٹوتیوں، سختیوں اور گرتے ہوئے معیار زندگی کے سالوں کا تناظر بن رہا ہے۔ یہ ہر جگہ طبقاتی جدوجہد کے لیے ایک تیار نسخہ ہے۔ بورژوازی اس وقت قرضوں کی روانی، متوازن بجٹ، ''فضول'' سماجی اخراجات میں کمی (جس سے مراد سکول، پنشنز اور ہسپتالوں پر آنے والے اخراجات ہیں، بینکوں کو دی جانے والی امداد یقیناً نہیں ہے!) کا تقاضا کر رہی ہے۔ یہ سچے سوفسطائیوں کی طرح بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان اقدامات سے مستقبل قریب میں تو بہت زیادہ معیشت سکڑے گی اور (کچھ لوگوں کے ہی!) معیار زندگی میں تیزی سے گراوٹ ہوگی، لیکن مستقبل بعید میں جادوئی طور پر یہ اقدامات ''ایک مستقل بحالی'' کی بنیاد کو تخلیق کر لیں گے۔ جس کا جواب بوڑھا کینز دے گیا تھا کہ ''مستقبل بعید تک تو ہم سب مر ہی جائیں گے۔''

صورتحال اتنی نازک ہے کہ کوئی بھی چیز بڑے بحران کا موجب بن سکتی ہے؛ یہ معیشت کے حوالے سے درست ہے، مثلاً امریکی تالہ بندی اور یورپ کے بڑھتے ہوئے قرضے کو دیکھیں، لیکن یہ مجموعی طور پر سماج کے حوالے سے بھی درست ہے۔ طبقاتی جدوجہد کسی بھی ایک یا دوسرے واقعے کے نتیجے میں پھٹ سکتی ہے (بلجیم کے آگ بجھانے والوں کا واقعہ)۔

بورژوازی کے سامنے سوال یہ ہے کہ ایسی بحران زدہ صورتحال میں حکمرانی کیسے کی جائے؟ یورپ کے زیادہ تر ممالک میں سیاسی پیچیدگی اپنا اظہار غیر مستحکم الحاقوں اور مفلوج پارلیمنٹوں کے ذریعے کر رہا ہے۔ بورژوا پارلیمانی جمہوریت کے اداروں کی صلاحیت کا اس کی آخری حد تک امتحان لیا جا رہا ہے۔

بڑھتا ہوا غیر جانب داری کا مظہر لوگوں کا سیاسی جماعتوں کے ساتھ بڑھتی ہوئی بیگانگی کا اظہار ہے اور مزدور رہنماؤں کے رویے کو دیکھ کر یہ بمشکل ہی حیران کن لگتا ہے۔ اپوزیشن میں ہوتے ہوئے بھی یہ سوشل ڈیموکریٹس کٹوتیوں کی پالیسی کی ہی حمایت کرتے رہتے ہیں۔ یہی سویڈیش سوشل ڈیموکریٹک پارٹی، برطانوی لیبر پارٹی، جرمن SPD (جو کہ اب انجلینا مرکل کے ساتھ ''بڑے الحاق'' کی تیاری کر رہے ہیں)، ہسپانوی PSOE اور یونان کی Pasok پارٹی وغیرہ میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی وہ وجہ ہے جس سے مایوسی اور بدگمانی کے رویے جنم لے رہے ہیں۔

یہاں تک کہ جرمنی میں بھی غیر جانب داری کی طرف رجحان بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ مرکل الیکشن جیتنے کے باوجود بھی اسمبلی کی اکثریت نہیں جیت سکی اور اسے حکومت بنانے کے لیے SPD کے ساتھ الحاق کرنا پڑ گیا۔ پارلیمنٹ میں کوئی بھی پارٹی 40 فی صد جرمن ووٹروں کی نمائندگی کر ہی نہیں رہی؛ Die Linke کی شہرت اپنے عروج لگ بھگ 12 فی صد سے کم ہو کر 9 فی صد سے بھی گر گئی ہے۔ لیکن قدرت خلا کو پسند نہیں کرتی اور SPD-CDU کے الحاق کا اقتدار میں آنے کا مطلب ہے کہ بس یہی حقیقی اپوزیشن ہے اور اسے ہی کچھ حمایت ملنے کے امکانات ہیں۔

ہم نے کئی ممالک کے نتائج میں نئی پارٹیوں کو ابھرتے ہوئے دیکھا ہے۔ سویڈن میں Greens، آئس لینڈ میں پاپولسٹ اور اٹلی میں Grillo، سویڈن جرمنی اور آئس لینڈ میں ''قزاق پارٹیاں''، یونان سویڈن ناروے اور فرانس میں انتہائی دائیں بازو کا ابھار اور برطانیہ میں یورپین یونین مخالف اور UKIP کا ابھار سامنے آیا ہے۔ یہ سب کچھ سماج میں موجود سیاسی ترتیب کے متعلق انتشار، بددلی اور عدم اعتماد کی کیفیت کی غمازی کر رہا ہے۔

یورپ میں بورژوا جمہوری اداروں کے خلاف نفرت بڑھتی جا رہی ہے خاص کر ان ممالک

میں جو کہ بحران سے شدید متاثر ہوئے ہیں۔ پرانا دو پارٹیوں پر محیط نظام (دایاں بازو با مقابلہ سوشل ڈیموکریسی) بحران میں ہے۔اس انتشار کا کچھ فائدہ سوشل ڈیموکریسی کے بائیں حصے کو مل رہا ہے جیسا کہ Syriza, IU اور فرانس میں FdG ابھر کر سامنے آئی ہیں۔اٹلی جہاں ایسا کچھ بھی موجود نہیں تھا وہاں بھی (پیٹی بورژوازی کی متذبذب احتجاجی تحریک) Grillo کی 5 star تحریک نے جزوقتی طور پر خلا کو پر کیا ہے۔

یہ پارٹیاں ابھی تک بھی سرمایہ دارانہ بحران کا کوئی حقیقی متبادل پیش نہیں کر رہیں اور اسی وجہ سے ابھی تک یہ پارٹیاں اُتنی تیزی سے نہیں بڑھ پا رہیں جتنی تیزی سے بڑھ سکتی تھیں اگر یہ سماج میں موجود غصے کی ذرا برابر بھی نمائندگی کرتیں۔بہر حال، اصلاح پسند پارٹیوں میں کوئی شنوائی نہ ہونے کی وجہ سے سماج میں موجود غصہ اپنا سیاسی اظہار الیکشنز میں 'غیر جانب دار یا بیگانہ' رویوں کی صورت میں کر رہا ہے۔سپین میں 2008ء کے انتخابات میں 75 فی صد ٹرن آؤٹ میں سے PP اور PSOE پارٹی نے مشترکہ طور پر 83 فی صد ووٹ حاصل کئے تھے۔آج، رائے عامہ کے مطابق ان کے حصے میں صرف 50 فی صد رہ گئے ہیں وہ بھی 50 فی صد کے ٹرن آوٹ میں (اور اس میں بھی تقریباً 50 فی صد لوگوں کا کہنا ہے، جو کہ خاصی بڑی تعداد ہے، کہ وہ یا تو ووٹ دیں گے ہی نہیں اور اگر دیں گے تو خالی دیں گے، یا پھر وہ نہیں جانتے کہ کسے ووٹ دینا چاہیے)۔

پرتگال میں حالیہ میونسپل الیکشنز میں بھی ہمیں ایسی ہی صورتحال دیکھنے کو ملی ہے۔غیر جانب دار ووٹوں کی تعداد میں پانچ لاکھ پچاس ہزار اضافہ ہوا؛ مسترد اور خالی ووٹوں کی تعداد تقریباً دوگنا اضافے کے ساتھ ایک لاکھ ستر ہزار ہوگئے؛ دائیں بازو کے حکمران اتحاد نے چھ لاکھ ووٹ گنوائے اور ''اپوزیشن'' میں موجود سوشل ڈیموکریٹک PS نے دو لاکھ ستر ہزار ووٹ گنوا دیئے؛ کمیونسٹ PCP نے بمشکل تیرہ ہزار ووٹ لیے؛ جبکہ بائیں بازو کی BE نے پینتالیس ہزار ووٹ گنوا دیئے۔

عوامی تنظیمیں

مرکزی مسئلہ ایک قیادت کا ہے۔سیاسی پارٹیوں اور ٹریڈ یونینز کے رہنما ماضی میں جی رہے

ہیں۔انہیں ابھی تک موجودہ بحران کی نوعیت سمجھ نہیں آسکی اور وہ ''پرانے اچھے دنوں'' کی واپسی کے امکان کے خواب دیکھ رہے ہیں۔وہ نامیاتی طور پر بورژوازی سے ناطہ توڑنے میں نااہل ثابت ہوئے ہیں،معیارِ زندگی میں بہتری کے لیے جدوجہد کرنا تو درکنار، وہ ماضی کی حاصلات کے دفاع کے لیے لڑی جانے والی لڑائی کی قیادت نہیں کر رہے۔

محنت کش طبقے کے بڑھتے ہوئے غصے اوران کی قیادت کی لاچارگی وسستی کے درمیان ایک شدید تضاد موجود ہے۔عمومی طور پر عوامی تنظیمیں اب بھی بہت ہی سست روی سے چل رہی ہیں۔یعنی قیادت کو دائیں بازو کی جانب جانے سے روکنے کے لیے کوئی حقیقی دباؤ موجود نہیں ہے۔پچھلے عرصے کا عمومی رجحان یہی چلا آرہا ہے۔قیادت کی تنزلی ناقابل عبور حد کی گہرائیوں تک پہنچ چکی ہے۔یہ ایک دہلا دینے والی حقیقت ہے کہ وہ تنظیمیں جو محنت کش طبقے نے سماج کو بدلنے کے لیے بنائی تھیں،وہی سماج کی تبدیلی کے عمل میں خوفناک رکاوٹ بن چکی ہیں۔

محنت کش طبقے کو بدظن کرنا اور مڈل کلاس کو ردِعمل پر اکسانا،تاریخی طور پر سوشل ڈیموکریسی کا فریضہ رہا ہے۔سوشلزم کے دفاع کا دکھاوا کرنا بھی مدتوں پہلے ہی ترک کیا جاچکا ہے اور اب یہ اپنی تمام تقاریر انتہائی ''مہذب'' اور ''قابلِ تحسین'' لہجوں میں سرمایہ داروں اور بینکاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کرتے ہیں۔یہ حکمران طبقے کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ریاست میں یہ زیادہ بڑے رتبے اور دفاتر کے قابل ہیں۔بورژوازی کی نظروں میں خود کو قابلِ اعتماد ''ریاستی کارندہ'' (بشمول خواتین) ثابت کرنے کے لیے ہمیشہ ''اصلاحات کے نام پر ہی'' کٹوتیوں اور دیگر رد اصلاحاتی پالیسیوں کی Conservatives سے بھی زیادہ پرجوش انداز میں حمایت کرتے ہیں۔

1970ء کی دہائی میں یورپ کی سوشلسٹ پارٹیوں میں حاوی بائیں بازو کے اصلاح پسند اب اپنے ماضی کا محض سایہ بن کر رہ گئے ہیں۔مضبوط نظریاتی بنیادیں نہ ہونے کی وجہ سے اب وہ دائیں بازو کا بھیانک سا دم چھلا بن کر رہ گئے ہیں۔مؤخرالذکر زیادہ پُراعتماد ہیں کیونکہ انہیں لگتا ہے کہ انہیں بڑے کاروباریوں کی حمایت حاصل ہے۔متضاد طور پر بائیں بازو والوں کو نہ ہی محنت کش طبقے اور نہ ہی خود پر کوئی اعتماد ہے۔یونینز میں موجود بائیں بازو کے اصلاح پسند اپنے سیاسی

حریفوں سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔تنخواہیں، حالات اور ٹریڈ یونین حقوق کے دفاع جیسی انتہائی بنیادی چیزوں کی خاطر کی جانے والی جدوجہد میں بھی یہ قابل مذمت ثابت ہوئے ہیں۔

کٹوتیاں کرنے کے بعد ''بائیں بازو'' کی حکومتوں کے خاتمے کا ایک پورا سلسلہ شروع ہو گیا؛ سپین، آئس لینڈ، ناروے، یونان اور کچھ عرصہ پہلے اٹلی میں بھی۔باقی بھی اپنی حمایت گرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں اور اگلے انتخابات میں یہ طاقت گنوا دیں گے(ڈنمارک،فرانس اور آئرلینڈ)۔آئرش لیبر پارٹی الیکشن سے پہلے کے رائے عامہ کے پول کے مطابق کٹوتیاں کرنے والے بورژوا الحاق میں جانے سے پہلے مقبولیت میں کافی اوپر جا رہی تھی۔اس کی حمایت 24 فی صد سے 4 فی صد تک گر گئی ہے۔

یونان کی سوشلسٹ پارٹی پاسوک جو کہ ایک زمانے میں عوامی بنیادیں رکھتی تھی اور کئی بار تقریباً 50 فی صد تک ووٹ حاصل کرنے والی پارٹی ہوا کرتی تھی،لیکن یورپی یونین اور حکمران طبقے کی پالیسیوں پر عمل درآمد کرنے کی وجہ سے اس کی حمایت گر گئی ہے۔پہلے تو اس جگہ پاپادیموس کی ''قومی'' حکومت نے لی اور پھر یہ دائیں بازو کے سمارس کے ساتھ الحاق کا حصہ بن گئی۔لیکن سب سے اہم مظہر انتہائی تیزی سے Syriza کا ابھر کر سامنے آنا ہے جس کی عوام میں مقبولیت پہلے 4 یا 5 فی صد اور پھر ایک نقطے پر 30 فی صد تک بھی پہنچ گئی تھی۔

جو بھی ہو،سب سے زیادہ تنزلی کا شکار عوامی تنظیمیں بھی عوامی دباؤ کا اظہار کر سکتی ہیں۔آنے والے دنوں میں عوامی رائے دائیں اور بائیں سمتوں میں جھولتے ہوئے بہت تیزی سے تبدیل ہوگی۔ہمیں اس کے لیے تیار ہونا ہوگا اور اس کے حقیقی معنوں کی وضاحت کرنا ہوگی۔بحران سے باہر نکلنے کے لیے عوام ایک کے بعد دوسری پارٹی اور قیادت کا امتحان لیں گے اور مسترد کرتے جائیں گے۔مسلسل مسترد کرتے رہنے کی خصوصیت یہ ہوگی کہ جو بھی حکومت میں ہوگا اور کٹوتیاں کرے گا۔

برطانیہ میں اس بات کے اشارے موجود ہیں کہ ملی بینڈ نیچے سے خاص کر ٹریڈ یونینز کی طرف سے دباؤ کی وجہ سے ٹوریوں اور لبرلز سے فاصلے بڑھا رہا ہے۔ملی بینڈ گھبراہٹ میں ہی سہی لیکن بڑے کاروباریوں اور بینکاروں کے خلاف غصے کا اظہار کر رہا ہے۔ایک بار اقتدار میں آنے

کے بعد ان اصلاح پسند قیادتوں پر دونوں اطراف یعنی حکمران طبقے اور عوام کی اطراف سے دباؤ میں شدید اضافہ ہو جائے گا۔ وہ دو پہاڑوں کے بیچ میں پس جائیں گے۔ دائیں اور بائیں جانب کافی کچھ ٹوٹے گا۔ کچھ معاملات میں تو یہ مکمل تباہ ہو جائیں گے، جیسا کہ اٹلی میں PRC اور ممکنہ طور پر یونان میں پاسوک ہو سکتی ہے۔ لیکن ہر صورت میں یہ بحران میں ہی داخل ہوں گے۔

جیسے جیسے بحران گہرا ہوتا جائے گا بائیں بازو کے رجحانات محنت کشوں کی پارٹیوں اور یونینز میں ابھرنا شروع ہو جائیں گے۔ مارکسی رجحان کو عوامی تنظیموں کا قریب سے مشاہدہ کرتے رہنا ہوگا اور متبادل کی تلاش میں آنے والے نوجوانوں اور محنت کشوں تک پہنچ کر ان کو جیتنے کی کوشش کرنا ہوگی۔

بحر حال، مستقبل میں ہماری مؤثر مداخلت کا انحصار اس بات پر ہے کہ آج ہم مارکسی رجحان کو کامیابی سے تعمیر کریں۔ عوامی تحریک میں بیس یا پچاس کیڈرز کے ساتھ مداخلت کرنا پانچ سو یا ایک ہزار کیڈرز کے ساتھ مداخلت کرنے سے بالکل ہی مختلف ہے۔ معیار کو مقدار میں تبدیل ہونا ہوگا، تا کہ مقدار ایک اعلیٰ پیمانے کے معیار کو جنم دے سکے۔ عوام کو حرکت میں لانے کی خاطر ایک لیور کا ہونا ضروری ہے اور وہ لیور صرف ایک مضبوط اور وسیع مارکسی رجحان ہی ہو سکتا ہے۔

یونینز

ٹریڈ یونینز مزدور طبقے کے انتہائی بنیادی ادارے ہیں۔ معمول کے حالات کی بانسبت بحران کے وقت میں مزدور یونینز کی کہیں ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ صنعت کے شعبے میں کچھ بہت اہم لڑائیاں، تنازعے اور جب کبھی بھی ٹریڈ یونین رہنماؤں نے ہڑتالوں، شعبہ جاتی ہڑتالوں وغیرہ کی قیادت کی ہے تو مزدوروں نے بڑے پیمانے پر اس کا ساتھ دیا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ بحران کے آگے ٹریڈ یونین قیادت مکمل طور پر نااہل ثابت ہو چکی ہے کیونکہ اب ان کے پاس کینشیئن ماڈل کی ہلکی پھلکی توانائی کے سوائے کوئی حقیقی متبادل موجود نہیں۔

سپین کے Balearic جزیروں پر اساتذہ کی ہڑتال تین ہفتوں تک جاری رہی اور جس

نے بہت بڑے پیمانے پر عوامی حمایت حاصل کی، مثلاً Palma جیسے آٹھ لاکھ کی آبادی والے جزیرے میں ایک لاکھ لوگوں نے مظاہرے کئے۔ ہڑتال طبقاتی جدوجہد کے ان روائتی طریقوں سے کی گئی جو کہ کہیں کھو سے گئے تھے، مثلاً عوامی اسمبلیاں، منتخب نمائندے، اساتذہ اور طلباء کا ساتھ وحمایت اور ہڑتالی فنڈز وغیرہ۔ جبکہ ٹریڈ یونین قیادت نے Balearic اساتذہ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور لڑائی کو اساتذہ اور اُس علاقے سے باہر لے جانے سے انکار کیا اور پھر تحریک کو واپس ہونا پڑا اور تھکاوٹ کے ہاتھوں شکست کھانی پڑ گئی۔

ٹریڈ یونین قیادت کی جانب سے ایک واضح جدوجہد کی حکمت عملی کی غیر موجودگی میں اگر زیادہ تر مزدور ایک 24 گھنٹے کی ہڑتال کی افادیت پر سوال اٹھاتے ہیں تو ان حالات میں یہ کوئی حیران کن بات نہیں ہونی چاہیے۔ درحقیقت، قیادت کی جانب سے اس طریقے کو غصہ نکلوانے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ یونان میں ایک دن کی مکمل ہڑتال کا طریقہ اب اپنی افادیت کھو چکا ہے۔ اس قسم کے اقدامات کا اٹھایا جانا ان مزدوروں کو شکوک میں مبتلا کر رہا ہے جو یہ سمجھ رہے ہیں کہ اب اس سے بڑھ کر کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ یونان جیسے حالات میں جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے غیر معینہ مدت تک کی ایک مکمل عام ہڑتال جس سے حکومت کو گرا دیا جائے۔

اس وقت سیاسی اور صنعتی محاذوں میں ہم غصے اور بے چینی کا اجتماع ہوتا دیکھ رہے ہیں جسے اظہار کا کوئی موقع نہیں مل پا رہا۔ سپین، پرتگال، یونان اور اٹلی میں لاکھوں کی تعداد میں نوجوان ان حالات کی طرف واپس آ رہے ہیں جو ان کے والدین اپنے پیچھے چھوڑ آئے۔

صحت عامہ اور تعلیمی نظام پر مسلسل حملے کئے جا رہے ہیں، بڑھتی ہوئی بیروزگاری کی لہر، خاص کر نوجوانوں میں، تعداد میں مسلسل بڑھتے ہوئے خالی گھروں اور فلیٹس کے ساتھ ساتھ قبضے کرنے اور خالی کروانے کے سکینڈل، گلیوں میں رہنے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد، جن میں زیادہ تر خود کو مڈل کلاس تصور کرتے تھے لیکن اب خطِ غربت سے نیچے آ چکے ہیں۔

ان حالات میں مزدور طبقہ پہلے سے کہیں زیادہ یونینز کو اپنے دفاع کی ہراول صف کے طور پر دیکھتا ہے۔ خود رو احتجاجی تحریکوں اور غصے کے دھماکوں کے مجموعے کی صورت میں اس سب دباؤ

کو سطح کے اوپر آنا ہوگا، اور اس کے اثرات حتمی طور پر عوامی تنظیموں پر بھی پڑیں گے۔

پہلے مرحلے میں عوامی تحرک اپنا اظہار ہڑتالوں، عام ہڑتالوں اور عوامی مظاہروں کی صورت میں کرے گا۔ یونان سپین اور پرتگال میں ہم یہ پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔ لیکن بحران کی گہرائی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اقدامات معیارِ زندگی پر ہونے والے نئے حملوں کو ہونے سے روک نہیں سکے۔

حتیٰ کہ بلجیم میں بھی جہاں آگ بجھانے والے اور ریل مزدوروں کی لڑاکا جدوجہد نے حکومت کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا لیکن یہ بھی ایک وقتی فتح ہی ثابت ہوگی۔ حکومت جو تھوڑا بہت بائیں ہاتھ سے دے رہی ہے وہ دائیں ہاتھ سے واپس لے لے گی۔ یونان میں تیس کے قریب عام ہڑتالیں ہوئی ہیں لیکن حکومت کے حملے ابھی بھی جاری ہیں۔

رفتہ رفتہ مزدور اپنے تجربے سے یہ سیکھ جائیں گے کہ زیادہ اثر انگیز اقدامات کی ضرورت ہے۔ وہ انقلابی نتائج اخذ کرنا شروع کر دیں گے۔ ٹراٹسکی نے عبوری مطالبات کی اہمیت پر زور دیا تھا کیونکہ ان کے ذریعے محنت کشوں کے شعور کو اس سطح تک لایا جاتا ہے جو تاریخ کا تقاضا ہوتے ہیں۔ لیکن اس نے یہ بھی نشاندہی کی تھی کہ شدید بحران کی صورت میں یہ مطالبات کافی نہیں ہوتے۔

''یقیناً، گرتے ہوئے سکیل اور مزدوروں کا اپنا دفاع کرنا کافی نہیں ہوتا۔ مزدوروں کو بھوک اور فاشسٹوں کے چاقو سے بچانے کے لیے یہ صرف پہلے بنیادی اقدامات ہیں۔ یہ اپنے دفاع کے پہلے اور بنیادی ذرائع ہیں۔ لیکن یہ خود کوئی مسئلہ حل نہیں کر سکتے۔ اہم فریضہ ایک بہتر معاشی نظام کے لیے راستہ ہموار کرنا ہے، جہاں تمام لوگوں کے مفاد میں پیداواری قوتوں کا استعمال زیادہ منصفانہ، منطقی اور بہتر طریقے سے کیا جا سکے۔''

''یہ ٹریڈ یونینز کے جدوجہد کے ''روزمرہ کے، عام'' طریقوں سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ آپ اس سے اختلاف نہیں کر سکتے کہ سرمایہ دارانہ تنزلی کے حالات میں بہت پیچھے کھڑی یونینز مزدوروں کے حالات کو مزید بدتر بننے سے روکنے میں نااہل ثابت ہوجاتی ہیں۔ زیادہ فیصلہ کن اور گہرے طریقہ کار ضروری ہیں۔ ذرائع پیداوار کی مالک اور ریاستی طاقت کی ملکیت رکھنے والی بورژوازی تمام معیشت کو ایک مکمل اور ناامید بے ترتیبی تک لے آئی ہے۔ معیشت کو تازہ اور سچے

ہاتھوں یعنی محنت کش طبقے کے ہاتھوں میں دینے کے لیے بورژوازی کے دیوالیہ پن کو جتاتے ہوئے واضح کرنا بہت ضروری ہے۔'' (ٹراٹسکی، سی آئی او کے ایک آرگنائزر سے بحث، 29 ستمبر 1938ء)

نوجوانوں کا کردار

موجودہ حالات کا ایک اہم مظہر، خاص کر نوجوانوں میں تیزی سے بڑھتی ہوئی بیروزگاری اور مکمل روزگار کی عدم دستیابی ہے۔ یہ بیروزگاروں کے وہ ذخائر نہیں ہیں جن کا ذکر مارکس نے کیا تھا۔ یہ مستقل، ڈھانچے کی بنیاد میں پنہاں اور نامیاتی بیروزگاری ہے جو سماج کو زہریلے کینسر کی طرح اندر سے چبھ رہی ہے اور اسے کھا رہی ہے۔

بیروزگاری کے سب سے بھیانک اثرات نوجوانوں پر پڑ رہے ہیں اور انہی کو ہی سرمایہ دارانہ بحران کا سب زیادہ بوجھ اٹھانا پڑ رہا ہے۔ جوانی کی امیدوں اور مقاصد کے سامنے ایک ناقابل عبور رکاوٹ کھڑی ہوگئی ہے۔ یہ کیفیت اس وقت اور بھی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے جب بیروزگاروں کی بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو۔ اس سے انتہائی دھماکہ خیز اور ناقابلِ تعین ملغوبہ تیار ہو رہا ہے۔

یہ نوجوانوں کی وہ پہلی نسل ہے جسے اپنے والدین سے بہتر معیار زندگی کی کوئی امید نہیں ہے۔ ان کا مستقبل لوٹ لیا گیا ہے۔ نوجوانوں کی ایک پوری نسل کو سرمایے پر قربان کیا جا رہا ہے۔ برازیل اور ترکی کی کیفیات کے مابین یقیناً بہت زیادہ فرق موجود ہے۔ لیکن کچھ مشترک پہلو بھی ہیں جنہوں نے نفرت اور غصے کی چنگاری کو بھڑکانے میں مدد فراہم کی ہے۔ یہی خصائص ہی دوسری جگہوں پر اسی طرح کے احتجاجوں کا باعث بنیں گی۔ ان میں سے سب سے اہم خاصیت نوجوانوں کی بیروزگاری تھی۔

بیروزگاری کا یہ مظہر لاطینی امریکہ، مشرقِ وسطیٰ اور ایشیا کے غریب ترین ممالک تک محدود

نہیں رہا۔غربت اور بیروزگاری کا امتزاج ایک ایسا دھماکہ خیز ملغوبہ ہے جو کسی بھی وقت کسی بھی ملک میں پھٹ سکتا ہے۔نوجوانوں کی بیروزگاری نام نہاد عرب بہار کی ایک بڑی وجہ تھی۔یورپ میں نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی بیروزگاری کے بھی ایسے ہی ریڈیکل اثرات ہو سکتے ہیں۔پہلے ہی نوجوانوں کی ریڈیکلائزیشن تمام یورپ میں ایک یا دوسرے مرحلے پر ایک عام مظہر بن چکی ہے۔

برطانیہ میں طلباء کے اندر ریڈیکلائزیشن کی لہر کا ساتھ بیروزگار نوجوانوں نے ملک بھر کے تمام بڑے شہروں میں دنگے وفسادات کی شکل میں دیا جس سے ریاست دہل کر رہ گئی۔یونان میں سکول کے طلباء کی ایک بڑی تحریک نے محنت کشوں کی بڑی تحریکوں کا ساتھ نبھایا۔سپین اور امریکہ میں ہمیں Occupy تحریک نظر آتی ہے جس کا بڑا حصہ نوجوانوں پر مشتمل تھا۔اس طرح کی کئی تاریخی مثالیں موجود ہیں۔1905ء کے روسی انقلاب کے پیچھے 1900ء اور 1901ء میں ہونے والے طلباء کے مظاہرے تھے۔فرانس میں 1968ء کے مئی کے دنوں کے شعلوں کا سبب طلباء کے وہ مظاہرے تھے جنہیں پولیس نے بڑی بے رحمی سے کچل دیا تھا۔

لینن نے کہا تھا: ''جس کے پاس نوجوان ہیں، مستقبل اسی کا ہے!''

ایک بہتر زندگی کی خاطر ناانصافی اور ظلم کے لڑنے کی اِن کی جبلتی خواہش کو شعوری اور منظم اظہار دیتے ہوئے، ہمیں ہر قیمت پر انقلابی نوجوانوں تک پہنچنے کا راستہ بنانا ہوگا۔اس کے حصول پر ہی بڑی حد تک عالمی مارکسی رجحان کی کامیابی یا ناکامی انحصار کر رہی ہے۔

کیا انقلاب کے لئے حالات تیار ہیں؟

ہم عالمی سطح پر ایک بالکل ہی نئی صورتحال میں داخل ہو رہے ہیں۔صرف پچھلے بارہ مہینے ہی اس بات کو واضح کرنے لیے کافی ہیں۔آنسو گیس کے بادلوں سے استنبول کی گلیاں بھر گئیں۔ Sao Paulo میں پولیس کے جتھوں نے کئی جسموں کے ڈھانچوں کو توڑا اور ایک کروڑ ستر لاکھ لوگوں نے مصری صدر کا تختہ الٹ دیا۔بلغاریہ میں احتجاج پھوٹ پڑے۔معاشی طور پر ابھرتے ہوئے ممالک میں موجود سیاسی بے چینی کا یہ ابھی محض آغاز ہے جو کہ انقلابی صلاحیت کے ساتھ حاملہ ہے۔

جدلیات ہمیں سکھاتی ہے کہ ہر چیز جلد یا بدیر اپنی الٹ میں بدل جایا کرتی ہے۔جدلیات کا یہ قانون گزشتہ بارہ ماہ میں بڑی شدت سے اپنی سچائی منواتا نظر آیا ہے۔ہمیں خود کو یہ یاد دلانا ہے کہ ابھی پچھلے دنوں تک تو برازیل اور ترکی دنیا کی ابھرتی ہوئی معیشتوں کے لیے مشعل راہ تھے۔

احمق اور بدگمان بڑی تعداد میں اور ہر جگہ بآسانی مل جایا کرتے ہیں۔یہ لوگ ماضی کی ہر شکست اور بیہودگی کا رونا دھونا کرتے نظر آئیں گے۔ایسے کئی سن رسیدہ خواتین وحضرات جو سوشلزم،محنت کش طبقے یہاں تک کہ خود پر سے بھی اپنا سارا اعتماد گنوا چکے ہوتے ہیں۔بے شمار ستم پیشہ افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو محنت کش طبقے کی تحریکوں پر انگلیاں اٹھانا اپنی فہم ودانش کی معراج سمجھتے ہیں۔ان کا بنیادی مقصد حیات ہی محنت کشوں اور نئی نسل کو کوستے رہنا،ان کی کامیابیوں کا ٹھٹھہ اور ان کی غلطیوں کا مضحکہ اڑاتے رہنا ہوتا ہے۔

اس قسم کے عناصر زیادہ تر سابقہ سٹالنسٹوں میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔کیونکہ سوشلسٹ انقلاب بارے یہ اپنا اعتماد ختم کر چکے ہوتے ہیں،چنانچہ ان کی اٹھتے بیٹھتے ایک ہی کوشش ہوتی ہے کہ یہ اپنی زہر آلود مایوسی کو ہر وقت ہر جگہ نئی نسل میں پھیلاتے رہیں تاکہ اس کو مایوس کیا جائے اور اس کے حوصلے کو کمزور کیا جائے کہ وہ کسی انقلابی تحریک میں شامل نہ ہونے پائیں۔

ایسے عناصر جنہیں ٹراٹسکی بجا طور پر بدبودار کیڑے قرار دیتا ہے،ایک ہی منطق بیان فرماتے ہیں کہ محنت کش طبقہ سوشلزم کیلئے تیار ہی نہیں ہے؛یہ کہ صورتحال کسی طرح بھی سازگار نہیں

ہے؛ وغیرہ وغیرہ۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ اس قسم کے لوگوں کیلئے صورتحال نہ کبھی سازگار ہوئی نہ ہی ہوگی۔ چونکہ ایسے لوگوں نے اپنے ذہنوں میں انقلاب کیلئے اپنے ہی ماڈل اور معیار بنائے ہوئے ہوتے ہیں، اس لئے یہ بہت سکون سے کسی آرام گوشے میں بیٹھ کر کچھ نہ کر کے سب کچھ کرتے رہتے ہیں۔

بہت ضروری ہے کہ ہم اس بنیادی نظریے کو سمجھیں کہ کسی بھی انقلاب کا سب سے نمایاں مظہر عام انسانوں کا تاریخ کے میدان میں قدم رکھنا ہوتا ہے۔ 1938ء میں ٹراٹسکی نے لکھا تھا کہ ''اس قسم کے سبھی مباحث، کہ تاریخی طور پر سوشلزم کیلئے صورتحال ابھی سازگار نہیں ہے، یا تو جہالت یا پھر شعوری دھوکہ دہی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پرولتاری انقلاب کیلئے درکار شرائط نہ صرف پک کر تیار ہو چکی ہیں، بلکہ یہ گلنا سڑنا بھی شروع کر چکی ہیں۔ ایک سوشلسٹ انقلاب کے بغیر، آنے والے تاریخی عرصے میں ایک بہت بڑی تباہی انسانی تہذیب کیلئے خطرہ بن کر سامنے کھڑی ہے۔ یہ اب پرولتاریہ اور خاص طور پر اس کے ہراول دستے کا فرض ہے کہ وہ پیش قدمی کرے۔ انسانیت کا تاریخی بحران صرف ایک نکتے پر اٹکا ہوا ہے اور وہ ہے ایک انقلابی قیادت کی کمی کا بحران۔''

یہ الفاظ آج کی عالمی صورتحال پر مکمل منطبق اور مصدق ہوتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ ابھی کل ہی لکھے گئے ہیں۔ ان سب بدگمانوں اور بدحواسوں کے برعکس جو کہ پرولتاریہ کے انقلابی کردار سے انکاری چلے آ رہے ہیں، ہم یہاں اس شکتی کو سامنے لانا چاہتے ہیں جو محنت کشوں اور نوجوانوں میں ہوتی ہے اور جن کی تصدیق ایک کے بعد ہونے والے واقعات کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ترکی میں، برازیل میں اور مصر میں ابھرنے والی شاندار انقلابی تحریکیں، یونان اور سپین میں ہونے والی عام ہڑتالیں، پرتگال کے بڑے مظاہرے جن کی وجہ سے حکومت کا خاتمہ ہوا۔ انڈیا اور انڈونیشیا میں ہونے والی ہڑتالیں؛ یہ سب کچھ واضح طور پر اعلان کر رہا ہے کہ انقلاب شروع ہو چکا ہے۔

لیکن ایک انقلاب کے شروع ہوجانے کی حقیقت کا کسی طور یہ مطلب نہیں ہوتا کہ انقلاب کامیاب بھی ہو چکا ہے۔اس کا دارومدار کئی ایک عناصر پر ہوتا ہے۔جن میں سب سے اہم ترین قیادت کی صلاحیت ہوتی ہے۔ بقول ہیگل ''ہم جب بھی ایک درخت کو اس کی سبھی شاخوں، ٹہنیوں اور پتوں سے ڈھکا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں، ایسے میں ہم ایک شجر کی بجائے ایک بیج کو دیکھ کر مطمئن نہیں ہونا چاہ رہے ہوتے۔'' (ہیگل، فینامینالوجی آف مائنڈ، دیباچہ)

جو کچھ اس وقت ہے وہ سوشلسٹ انقلاب کی ابتدائی آگاہی ہے۔کئی ملکوں میں طبقاتی جدوجہد کی طویل مدت پر محیط جمود کی کیفیت کے بعد یہ عوام کی ابتدائی بیداری کی لہر ہے۔ایک اتھلیٹ کو ایک لمبے عرصے کے وقفے کے بعد دوبارہ میدان میں اترنے کیلئے اپنے اعضا و اعصاب کو از سرنو مشقت و محنت سے گزارنا پڑتا ہے تاکہ سنجیدہ پرفارمنس کے قابل ہو سکے۔ایسے ہی محنت کش طبقے کو بھی اس پر عائد تاریخی فریضے کی ادائیگی کیلئے ایک لازمی تجربے کی بھٹی میں سے گزرنا ہوتا ہے۔

ایک عمومی قاعدے کے طور پر عوام اپنے تجربات سے ہی اسباق حاصل کرتے ہیں۔کبھی کبھی یہ مرحلہ بہت ہی صبر آزما اور تکلیف دہ بھی ہوتا ہے۔اگر لینن اور ٹراٹسکی جیسی دوراندیش قیادت اور ایک مضبوط مارکسی پارٹی موجود ہو تو سیکھنے کا یہ عمل جلد بھی اور کم تکلیف دہ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر پچھلے سال جون میں مصر میں بالشویک پارٹی جیسی کوئی پارٹی ہوتی تو کون شک کر سکتا ہے کہ انقلابی محنت کش اور نوجوان اقتدار اپنے ہاتھوں میں نہ لے چکے ہوتے!

موجودہ سیاسی ڈھانچہ آزمائش میں آیا ہوا ہے اور تباہی کی طرف گامزن ہے۔یہ کیفیت صرف یونان تک ہی محدود نہیں ہے۔کئی یورپی سفارتکارنجی گفتگو میں ایک طاقتور ''جمہوریت کے بحران'' بارے چہ میگوئیاں کرتے نظر آرہے ہیں۔اور یہی حقیقت بھی ہے کہ بورژوا جمہوریت کے ادارے کڑی آزمائش سے دوچار ہو رہے ہیں اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہے ہیں۔یورپی حکومتوں خاص طور پر جرمنی میں یہ تاثر زور پکڑتا جا رہا ہے کہ کٹوتیوں کی پالیسیوں کے تسلط سے سماجی

تنازعات اتنی شدت اختیار کر سکتے ہیں کہ جن سے سارا سماجی ڈھانچہ ہی منہدم ہوسکتا ہے۔

مصر میں مرسی حکومت کے خاتمے نے ہر ایک حکومت کو دہلا کے رکھ دیا تھا جب ایک کروڑ ستر لاکھ انسانوں نے سڑکوں پر نکل کر حکومت کو چلتا کر دیا، سب سہم گئے کہ ایسا ہی یورپ میں بھی ممکن ہوسکتا ہے۔ جریدہ فنانشل ٹائمز اس ''سکون دشمن'' کیفیت کا 1848ء کے انقلابی سال سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''یہ سب 1848ء کی یاد دلاتا ہے۔ میٹرنچ کا اقتدار کے بے دردی سے خاتمے سے پہلے کھڑکی سے باہر کھڑے ہجوم پر حقارت بھری نظر ڈالنا، گیزو کا وزارت سے استعفیٰ لکھتے وقت صدمے سے سانس کا رک جانا اور تھائیرز، جو ایک دن کے لئے وزیر اعظم تھا، پر لوگوں کے پھبتیاں کستے ہجوم کی وجہ سے اپنی بگھی میں تشنج کا حملہ۔''

بورژوا معاشی ماہرین اعتراف کر رہے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کا تناظر اگلے بیس سالوں تک کٹوتیوں پر مبنی ہے۔ اس کا مطلب ہے طبقاتی جدوجہد کی دو دہائیاں۔ اس جدوجہد میں یقینی طور پر کئی نشیب و فراز آئیں گے، مایوسیاں ہوں گی، بدگمانیاں ہوں گی، شکستیں ہوں گی، یہاں تک کہ رجعتیت کا ردعمل بھی ہوگا۔ لیکن جس قسم کی فضا آج کل ہے اس میں ایسی کیفیات کم وقت پر مبنی ہوں گی۔ اور ہر ایک شکست ایک بڑی لڑائی کا سبب بنے گی۔ جلد یا بدیر کسی ایک یا دوسرے ملک میں طاقت کا سوال سامنے آئے گا۔ یہ سوال، فیصلہ کن لمحات میں، داخلی عنصر کا سوال ثابت ہوگا۔ جسے اس طاقت کے سوال کا جامع اور عملی جواب سامنے رکھنا ہوگا اور وہ بھی ایک لازمی قیادت کی صورت میں۔

ہر جگہ اور ہر سطح پر ناقابل برداشت تضادات جنم لے رہے ہیں۔ سماج میں عمومی بدحالی کا واحد سبب محض معاشی عناصر؛ بیروزگاری، اور گرتا ہوا معیار زندگی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ سرمایہ دارانہ سماج کے سبھی اداروں کی نااہلی اور بے بسی کا مجموعی اظہار ہے۔ جن میں کلیسا، میڈیا، بینکار، پولیس، عدالتی نظام وغیرہ سب شامل ہیں۔ عالمی پیمانے پر ہونے والے واقعات ان کیفیتوں کو اور بھی اذیتناک بنا رہے ہیں (عراق، افغانستان اور شام وغیرہ)۔

ہر جگہ کیفیت ایک جیسی بھی نہیں ہے، مثال کے طور پر یونان میں صورتحال جرمنی کی نسبت زیادہ ایڈوانس ہے۔لیکن ہر جگہ سطح کے کچھ ہی نیچے ایک پنپتی اور پھٹتی بے چینی موجود ہے، ایک ایسا احساس ہر جگہ جاگزیں ہو رہا ہے کہ سماج میں کچھ ایسا ہے جو بہت برا اور بہت غلط ہے۔اور جو کہ نا قابل برداشت بھی ہے اور یہ بھی کہ موجودہ سیاسی قیادتیں کسی طور ہم عام لوگوں کی نمائندہ نہیں ہیں۔سوشلسٹ انقلاب کیلئے صورتحال یا تو پک چکی ہے یا پھر یہ پکتی جا رہی ہے۔لیکن داخلی عنصر کہاں ہے! جیسا کہ ٹراٹسکی نے کہا تھا کہ سارا مسئلہ ہی دراصل قیادت کا ہے۔

معروضی تاریخی وجوہات کے ایک سلسلے کی روشنی میں تحریک پیچھے دھکیلی جا چکی ہے۔حقیقی مارکسزم لینن ازم کی قوتیں ایک بہت محدود اقلیت میں ہیں اور عوام سے دور ہیں۔اور یہی بنیادی و مرکزی مسئلہ بھی ہے اور تضاد بھی جو حل نہیں ہو رہا۔ بہت لازمی ہو چکا ہے کہ اس کے حل کیلئے درکار کیڈروں کو انقلابی تنظیموں میں ریکروٹ کیا جائے، انہیں تربیت فراہم کی جائے اور انہیں بڑی ورکرز تنظیموں کے ساتھ مربوط و متحرک کیا جائے۔

یہ وقت طلب کام ہے۔ہمارے پاس اس عمل کی سست روی کے باعث کچھ وقت تو ہوگا۔ لیکن ہمارے پاس دنیا بھر میں اتنا زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔ مارکسزم کی قوتوں کی تعمیر کے فریضے کا ادراک اور ادائیگی ایک فوری عمل کی اہمیت کا تقاضا کر رہا ہے، تاکہ یہ سمجھا جا سکے کہ مستقبل کی بڑی کامیابیوں کا راستہ، حال کی چھوٹی چھوٹی کامیابیوں سے ہی سامنے آتا ہے۔ ہمارے پاس درکار نظریات ہیں؛ ہمارے تناظروں کو واقعات کے سلسلے تصدیق فراہم کرتے آ رہے ہیں۔اب ہمیں ان نظریات کو لازمی طور پر محنت کش طبقے اور نوجوانوں کی طرف لے کر جانا ہوگا۔محنت کشوں اور نوجوانوں کی طرف جانے والا راستہ بہت ہی کشادہ ہے۔آئیں اعتماد کے ساتھ اس راستے کی جانب پیش قدمی کریں۔

عالمی مارکسی رجحان کی تعمیر کیلئے آگے بڑھو!

عالمی سوشلسٹ انقلاب زندہ باد۔